قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹ شمارہ: ۱۲

ذوالحجہ: ۱۴۳۷ھ - اکتوبر: ۲۰۱۶ء

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی نمبر: 5، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 101900-397-7 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ
انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا
وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 Ext. 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk *Email*: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر مطبع: ایجوکیشنل پریس طابع: فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

حجاج کرام سے چند گزارشات!!! ۳ محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

حج بیت اللہ ۹ محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

انکارِ حدیث کیوں؟ ۱۵ مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ

مغرب کی اذان و اقامت کے درمیان وقفہ کی حد! ۲۰ مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

خطبۂ صدارت! حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ۲۵ مرسلۂ: مولانا محمد عابد

فنِ جرح وتعدیل کی ابتدا اور ارتقا...ایک طائرانہ نظر ۳۲ مولوی عبداللہ بن مسعود

سلطان ٹیپوؒ (فتح علی خان قریشی) اور مذہبی رواداریاں ۴۱ معاذ کولہاپوری، ڈابھیل

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ...مشائخ کی نظر میں (قسط:۲) ۴۵ جناب نعمان محمد امین

یادِ رفتگان

نانی مرحومہ کی وفات! اہلیہ حضرت مولانا گل محمد رحمۃ اللہ علیہ ۵۱ مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

دار الافتاء

بھینس کی قربانی! ۵۴ ادارہ

عورت کا بغیر محرم کے حج پر جانا! ۵۷ ادارہ

نقد و نظر

۶۳ ادارہ

حجاج کرام سے چند گزارشات!!!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

حج ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ ۹ ھ میں حج کی فرضیت نازل ہوئی، اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا اور اگلے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی ادائیگی کا ارادہ فرمایا تو عمومی طور پر اعلان کرایا، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوکر حج کے مناسک اور احکام سیکھ سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر مرحلہ پر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک عمل کو تعلیم کے انداز میں سکھایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حج کے متعلق جو سوالات کیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید سے فرمایا کہ: ’’مجھ سے مناسک حج اچھے انداز میں سیکھ لو، شاید اگلے سال میں تم میں موجود نہ ہوں۔‘‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے ایک ایک عمل کو محفوظ کیا اور اگلی نسلوں تک پہنچایا۔

اسی لیے حج پر جانے والے ہر مرد اور عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسائلِ حج اور اعمالِ حج کو ضرور سیکھ کر جائے اور اپنے حج کو ہر قسم کے گناہوں، نافرمانیوں اور کوتاہیوں سے آلودہ ہونے سے محفوظ کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ حج کے مسائل اور احکام کے متعلق چھوٹی بڑی کتابیں علمائے کرام نے آسان اور بڑے سہل انداز میں لکھی ہیں، ان کو پڑھے اور ان کو اپنے ساتھ رکھے، تاکہ حج جیسی عبادت جس کو بسااوقات زندگی میں ایک بار ہی ادا کرنے کی سعادت ملتی ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی کمی کوتاہی نہ رہ جائے۔

اب ہم حجاج کرام سے چند گزارشات کرنا چاہتے ہیں، جن کی طرف حجاج کرام کو توجہ کرنا

انتہائی لازمی اور ضروری ہے، تاکہ ان کا حج صحیح معنی میں حج ہو اور جو اجر وثواب اللہ تعالیٰ نے اس حج جیسی عبادت کی ادائیگی پر رکھا ہے، اس کے یہ مستحق ہوں:

①:.....حجاج کرام کو چاہیے کہ سفرِ حج کے دوران نماز باجماعت کا خاص طور پر اہتمام فرمائیں، عام طور پر حجاج کرام اس طرف توجہ نہیں دیتے، بلکہ بعض اوقات نماز کے پابند حضرات بھی اس میں سستی کر جاتے ہیں۔

②:.....خواتین کو چاہیے کہ وہ حج کے پورے سفر میں پردے کا ضرور اہتمام کیا کریں، یہ ٹھیک ہے کہ مستورات کا احرام چہرہ کا کھلا رکھنا ہے، لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ پردہ ہی نہ کریں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا عمل ہماری مستورات کے لیے بہت ہی عمدہ نمونہ ہے، آپؓ فرماتی ہیں کہ: ہم احرام کی حالت میں عام طور پر اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھیں، لیکن جب مرد سامنے آتے تو ہم چہرہ کے سامنے کوئی چیز کر دیتیں، تاکہ غیرمحرم ہمیں دیکھ نہ سکیں، حدیث کے الفاظ اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

’’**عن عائشةؓ قالت: کان الرکبان یمرون بنا ونحن مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم محرمات، فإذا جاوزوا بنا سدلت إحدانا جلبابَها من رأسها علیٰ وجهها فإذا جاوزونا کشفناه، رواه ابوداؤد وابن ماجة۔**‘‘ (مشکوٰۃ، ص:۲۳۶، طبع: قدیمی کتب خانہ)

’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: ہم (حجۃ الوداع میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حالت احرام میں تھیں، جب سوار ہمارے پاس سے گزرتے تو ہم اپنے سر سے نیچے اپنے چہرے پر بھی پردہ ڈال لیا کرتیں اور جب وہ ہمارے پاس سے گزر جاتے تو ہم دوبارہ اپنا چہرہ کھول لیا کرتیں۔‘‘

ہماری مسلمان بہنوں کو بھی چاہیے کہ وہ حج کے سفر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل کو اپنا نمونہ بنائیں، اس لیے علماء کرام نے کہا ہے کہ آج کے دور میں اس کی بہترین صورت وہ ہیٹ ہے جو عام طور پر احرام کے ساتھ مل جاتا ہے، عورتیں اس کے پہننے کا اہتمام کریں۔

③:...... عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حج کے لیے دنیا بھر سے آنے والی خواتین کا لباس بہت ہی ساتر ہوتا ہے، لیکن ہمارے پاکستان اور ہندوستان کی خواتین خصوصاً دیہات کی خواتین اس کا خیال نہیں کرتیں جو کہ انتہائی افسوس کی بات ہے۔

④:...... اسی طرح مکۃ المکرّمہ میں خواتین نماز کے لیے مردوں کی صفوں میں گھس کر کھڑی ہو جاتی ہیں، جتنا بھی اس سے منع کیا جائے، وہ باز نہیں آتیں، حالانکہ ایسا کرنا شریعت میں منع ہے، اس کی وجہ سے نہ ان کی نماز صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی اس مرد کی جو ان کے دائیں بائیں اور ان کے پیچھے ہوتا ہے، عورتوں کو اس سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

۵:...... ایک اہم مسئلہ جو غالبًا ایک سال سے شروع ہوا ہے، وہ یہ کہ حرمین میں جمعہ کی پہلی اذان زوال سے بھی پہلے دے دی جاتی ہے، جس کے سننے کے بعد لوگ سنتوں کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، حالانکہ صریح احادیث میں اس وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

۱:...... ’’عن عقبة بن عامرؓ قال: ثلٰث ساعات کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ینهانا أن نصلی فیهن وأن نقبر فیهن موتانا حین تطلع الشمس بازغة حتّٰی ترتفع وحین یقوم قائم الظهیرة حتی تمیل الشمس وحین تضیف الشمس للغروب حتی تغرب ، رواه مسلم۔‘‘ (مشکوٰۃ، ص:۹۴، طبع: قدیمی کتب خانہ)

’’حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سرورِ کونین ﷺ تین وقتوں میں نماز پڑھنے اور اپنے مردوں کو دفن کرنے سے منع فرماتے تھے، اول: آفتاب کے نکلنے کے وقت، یہاں تک کہ بلند ہوجائے، دوسرے: دوپہر کا سایہ قائم ہونے یعنی نصف النہار کے وقت، یہاں تک کہ آفتاب ڈھل جائے اور تیسرے اس وقت جبکہ آفتاب ڈوبنے لگے، یہاں تک کہ غروب ہوجائے۔‘‘

۲:...... ’’عن عمرو بن عبسةؓ قال: قدم النبی صلی اللّٰه علیه وسلم المدینة ، فقدمت المدینة فدخلت علیه ، فقلت: أخبرنی عن الصلٰوة . فقال : صل صلوة الصبح ، ثم أقصر عن الصلٰوة حین تطلع الشمس حتی ترتفع ؛ فإنها تطلع بین قرنی الشیطٰن وحینئذ یجد لها الکفار ، ثم صل فإن الصلٰوة مشهودة محضورة حتی یستقل الظل بالرمح ثم أقصر عن الصلٰوة ؛ فإن حینئذ تسجر جهنم ، فإذا أقبل الفیء فصل ؛ فإن الصلٰوة مشهودة محضورة حتی تصلی العصر ، ثم أقصر عن الصلٰوة حتی تغرب الشمس ؛ فإنها تغرب بین قرنی الشیطٰن وحینئذ یسجد لها الکفار، رواه مسلم۔‘‘ (مشکوٰۃ، ص:۹۴، قدیمی کتب خانہ)

’’حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورکونین ﷺ مدینہ تشریف لائے تو میں بھی مدینہ آیا اور آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے نماز کے اوقات بتادیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صبح کی نماز پڑھو اور پھر نماز سے رُک جاؤ، جب تک کہ آفتاب طلوع ہوکر بلند نہ ہوجائے؛ اس لیے کہ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کافر (سورج کو پوجنے والے) اس کو سجدہ کرتے ہیں، پھر (اشراق کی) نماز پڑھو؛ کیونکہ اس وقت کی نماز مشہودہ ہے (یعنی فرشتے نمازی کی گواہی دیتے ہیں) اور اس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ (جب) سایہ نیزہ پر چڑھ جائے اور زمین پر نہ پڑے (یعنی ٹھیک دوپہر ہوجائے)

تو نماز سے رُک جاؤ؛ کیونکہ اس وقت دوزخ جھونکی جاتی ہے، پھر جب سایہ ڈھل جائے تو (ظہر کے فرض اور جو چاہو نفل) نماز پڑھو، کیونکہ یہ وقت فرشتوں کے شہادت دینے اور حاضری کا ہے، یہاں تک کہ تم عصر کی نماز پڑھ لو، پھر نماز سے رُک جاؤ، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوجائے؛ کیونکہ آفتاب شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار (یعنی آفتاب کو پوجنے والے) اس کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔''

۳:.....''عن عبداللّٰہ الصنابحیؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن الشمس تطلع ومعها قرن الشیطٰن فإذا ارتفعت فارقھا ، ثم اذا استوت قارنھا، فإذا زالت فارقھا ، فإذا دنت للغروب قارنھا ، فإذا غربت فارقھا ، ونھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الصلوٰۃ فی تلک الساعات، رواہ مالک واحمد والنسائی۔'' (مشکوٰۃ،ص:۹۵،قدیمی کتب خانہ)

''حضرت عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان کا سینگ ہوتا ہے، پھر جب وہ بلند ہوجاتا ہے تو وہ الگ ہوجاتا ہے، پھر جب دوپہر ہوتی ہے تو شیطان آفتاب کے قریب آجاتا ہے اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شیطان اس کے قریب آجاتا ہے اور جب آفتاب غائب (یعنی غروب) ہوجاتا ہے تو شیطان اس سے جدا ہوجاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات میں (یعنی آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت اور ٹھیک دوپہر کے وقت) نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔''

ٹھیک ہے کہ ایک روایت میں جمعہ کا استثناء ہے، لیکن وہ روایت ضعیف ہے، جیسا کہ صاحبِ مشکوٰۃ نے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''عن أبی الخلیل عن أبی قتادۃؓ قال: کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کرہ الصلوٰۃ نصفَ النھار حتّٰی تزول الشمس إلا یوم الجمعۃ وقال: إن جھنم تسجر إلا یوم الجمعۃ رواہ أبوداؤد وقال: ''أبوالخلیل لم یلق أباقتادۃؓ۔'' (مشکوٰۃ،ص:۹۵،طبع: قدیمی کتب خانہ)

''حضرت ابوالخلیل رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک دوپہر کے وقت جب تک کہ سورج نہ ڈھل جائے نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھتے تھے، علاوہ جمعہ کے دن کے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ علاوہ جمعہ کے دن کے روزانہ (دوپہر کے وقت) دوزخ جھونکی جاتی ہے۔ اس روایت کو امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ سے ابوالخلیلؒ کی ملاقات ثابت نہیں ہے (لہٰذا اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے)۔''

حجاج کرام کو چاہیے کہ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد سنتیں اور کوئی نفل نماز وغیرہ نہ پڑھیں، تاکہ اس وعید سے بچ سکیں اور ممنوع اوقات میں نماز پڑھنے والے فعل کے بھی مرتکب نہ ہوں۔

ہمارے مقتدا علماء حضرات کو بھی چاہیے کہ وہ سعودی عرب کے حکام اور علمائے کرام کے سامنے اس مسئلہ کو اُٹھائیں اور اُنہیں باور کرائیں کہ اس غیر مشروع فعل کے ارتکاب کا وہ سبب نہ بنیں اور جس طرح پہلے جمعہ کے دن زوال کے بعد پہلی اذان دی جاتی تھی اور اس کے چند منٹ بعد دوسری اذان دی جاتی تھی، اس عمل کو جاری رہنے دیں اور اس نئے طریقے کو رائج کر کے صریح احادیث کی مخالفت کا باعث نہ بنیں۔

٦:...... اسی طرح عام طور پر آج کل حجاج منیٰ میں رہنے کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں، بلکہ مشاہدہ ہے کہ بعض حج گروپ کے لیڈران خاص طور پر اپنے حجاج کو اس کی ترغیب دینے لگے ہیں کہ آپ عزیزیہ میں اپنی بلڈنگ میں رہیں اور صرف جمرات کو کنکریاں مارنے کے لیے آپ منیٰ میں جائیں، اور کئی لوگ رات گزارنے کے لیے یا تو مکہ اپنی بلڈنگ میں چلے جاتے ہیں یا عزیزیہ میں اپنی رہائش پر چلے جاتے ہیں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف طواف کے لیے تو بیت اللہ تشریف لے گئے، اس کے علاوہ تینوں دن و رات منیٰ ہی میں رہے، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منیٰ میں رہنا سنت مؤکدہ ہے، باقی ائمہ منیٰ میں رات گزارنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں نہ رہنے والوں کو تادیب فرماتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد ارشاد القاسمی اپنی تالیف ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ حج''، میں منیٰ میں رہنے کے بارہ میں روایات کا احاطہ کیا ہے، جو کہ درج ذیل ہیں:

۱:..... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ایام تشریق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں ہی رہے۔ (ابوداؤد، ص:۲۷۱، اعلاء السنن، ص:۱۸۹)

۲:..... عبدالرحمٰن بن فروخ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں رہے اور وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام کیا۔ (اعلاء السنن، ص:۱۹۰)

۳:..... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: عقبہ کے پیچھے (مکہ کے حدود میں) کوئی نہ گزارے ایام تشریق کے دنوں میں۔

۴:..... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو زجر و توبیخ فرمایا کرتے تھے اس بات پر کہ منیٰ کا قیام کوئی چھوڑ دے۔ (فتح القدیر، ص:۵۰۲)

۵:..... ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منع فرمایا کرتے تھے جمرہ عقبہ کے پیچھے (مکہ کے حدود میں) کوئی قیام کرے۔ (فتح القدیر)

۶:..... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ممنوع قرار دیتے تھے کہ وہ منیٰ کے دنوں میں مکہ مکرمہ میں رات گزارے۔ (فتح القدیر، ص:۵۰۲)

حضرت مولانا فائدہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''خیال رہے کہ مزدلفہ سے ۱۰؍ کی صبح کو منیٰ آیا جاتا ہے، اب اس کا قیام منیٰ میں ہی ۱۲؍ تک یا ۱۳؍ تک رہے گا۔ ۴؍ دن ہوئے اور ایک قیام ۸؍ تاریخ کو مکہ مکرمہ سے آنے اور عرفات جانے سے قبل کیا تھا۔ یہ منیٰ کے ۵؍ ایام ہیں، یہ ایام منیٰ میں گزارنا سنت مؤکدہ ہے۔ رات کو کسی دوسرے مقام حتیٰ کہ مکہ مکرمہ میں بھی قیام درست نہیں۔ آپ نے منیٰ میں قیام بھی فرمایا اور یہی حکم فرمایا، چنانچہ آپ رات کو نفلی طواف کرنے جاتے تو رُکتے نہیں، منیٰ چلے آتے۔

۷:.... اسی طرح طوافِ زیارت کے لیے خواہ دس یا گیارہ کو جائے تو طواف سے فارغ ہوکر منیٰ چلا آئے گا اور رات منیٰ میں ہی گزارنی ہوگی، جیسا کہ شرح لباب میں ہے:

''**ولا یبیت بمکة ولا فی الطریق لأن البیتوتة بمنٰی لیالیها سنة عندنا واجبة عند الشافعیؒ۔**'' (شرح لباب، ص:۲۳۵)

۸:.... ہدایہ میں ہے: منیٰ کے علاوہ میں رات گزارنی مکروہ ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ رات نہ گزارنے پر لوگوں پر زجر وتوبیخ فرمایا کرتے تھے: ''**ولا یکره أن لا یبیت بمنٰی لیالی الرمی لأن النبی علیه الصلٰوة والسلام بات بمنٰی وعمر رضی اللّٰه عنه کان یؤدب علٰی ترک المقام بها۔**'' (فتح القدیر:۵۰۱)

۹:.... عنایہ میں ہے کہ منیٰ کا قیام اس لیے مقرر کیا گیا تاکہ رمی جو حج کے مناسک میں ہے آسان ہو۔ (عنایہ علی الفتح، ص:۵۰۱)

۱۰:.... جزء حجۃ الوداع میں ہے کہ جمہور علماء منیٰ میں رات گزارنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سنت قرار دیتے ہیں۔ (حجۃ الوداع، ص:۱۷۲)

۱۱:.... طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایام تشریق کے دنوں میں منیٰ میں قیام نہ کرنا مکروہ تحریمی ہے:

''**دلالة الأثر علٰی لزوم المبیت بمنٰی فی لیالیها ظاهرة أن لفظ ظاهر الهدایة یشعر بوجوبها عندنا۔**'' (اعلاء السنن، ص:۱۹۰) (بحوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ حج، ص:۴۷۶-۴۷۷)

حجاج کرام سے درخواست ہے کہ حج کے اعمال کو اسی انداز میں ادا فرمائیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ہمارے اسلاف نے ادا فرمائے ہیں۔ اپنی تن پسندی کی بنا پر اپنی طرف سے ہر ہر عمل میں اپنے خام خیالات اور آراء پر عمل شروع کردیا تو حج کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ اس لیے خدارا! حج کے اعمال میں جدتیں پیش کرنے سے باز رہیں، اور مخلوقِ خدا کو اسی راستے پر رکھیں، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے لیے طے کیا ہے، **وماذٰلک علی اللّٰه بعزیز۔**

وصلی اللّٰه تعالٰی علٰی خیر خلقه سیدنا محمد وعلٰی آله وصحبه أجمعین

حج بیت اللہ

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یوں تو ہر عبادت کے لیے قدم قدم پر رحمت وعنایت اور اجر وثواب کے وعدے فرمائے ہیں۔ نماز وزکوٰۃ اور روزہ واعتکاف وغیرہ سب پر جنت اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کے وعدے ہیں، لیکن تمام عبادات میں ''حج بیت اللہ'' کی شان سب سے نرالی ہے۔ حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے، جس کی تکمیل پر بارگاہِ عالی سے رضا وخوشنودی کی آخری سند عطا کی جاتی ہے، کتنے عجیب انداز سے فرمایا گیا ہے:

'' والحج المبرور لیس لہٗ جزاء إلا الجنۃ ۔''

ترجمہ: ......''اور ''حج مبرور'' کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے۔''

گویا ''حج مبرور'' ایک ایسی عالی شان عبادت ہے کہ بجز جنت کے اس کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے!۔ ''حجِ مبرور'' جس کا بدلہ صرف جنت ہی ہوسکتی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریاکاری کا شائبہ نہ ہو، یعنی تمام سفرِ حج میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے آدمی بچے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے، بلاشبہ اس شرط کا نبھانا بھی بہت مشکل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل ہی سے یہ مشکل مرحلہ طے ہوسکتا ہے۔

عشق ومحبت کا سفر

حج کی ظاہری صورت بھی عجیب وغریب ہے اور اس میں غضب کی جاذبیت ہے۔ قدم قدم پر عشق ومحبت کی پُر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں، سب سے بڑے دربار کی حاضری کا قصد ہے، دل میں دیارِ محبوب کی آرزوئیں مچلتی ہیں، سفر طویل ہے، حلال وطیب توشۂ سفر کا اہتمام کیا جارہا ہے، نیک اور صالح رفیق کی تلاش ہورہی ہے، چشم پُرنم کے ساتھ عزیز واقارب سے رخصت ہورہے ہیں، لیکن

دین کا حساب بے باق کیا جارہا ہے، حق حقوق کی معافی طلب کی جارہی ہے، کوشش یہ ہے کہ اس دربار میں حاضر ہوں تو کسی کا معمولی حق بھی گردن پر نہ ہو۔ لیجئے! روانگی کا وقت آیا، غسل کر لیجئے اور دو سفید نئی چادریں پہن لیجئے، گویا انسان خود اپنے ارادہ واختیار سے سفرِ آخرت پر روانہ ہورہا ہے۔ پہلے غسل سے بدن کے ظاہری میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور پھر کفن کی چادریں اوڑھ کر دوگانۂ احرام ادا کرتا ہے، اس طرح گویا توبہ وانابت سے دل کے میل کچیل سے اپنے باطن کو پاک صاف کرتا ہے اور ظاہری وباطنی نظافت کے ساتھ شاہی دربار میں نذرانۂ عشق ومحبت پیش کرنے کا عہد کر لیتا ہے۔ ارحم الراحمین نے دعوت دے کر بلایا ہے اور شاہی دربار سے بُلاوا آیا ہے، یہ فوراً ''بیت اللہ الحرام'' کے شوقِ دیدار میں اس دعوت پر ''لبیک أللّٰھم لبیک'' (میں حاضر ہوں، اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستانہ وارسوئے منزل روانہ ہوجاتا ہے۔

یہ اس والہانہ وعاشقانہ عبادت کی ابتدا ہے، زیب وزینت کے تمام مظاہر ختم، راحت و آسائش کے تمام تقاضے فراموش، نہ سر پر ٹوپی، نہ پاؤں میں ڈھب کا جوتا، نہ بدن پر ڈھنگ کا کپڑا، دیوانہ وارر واں دواں منازلِ عشق طے کرتا ہوا جارہا ہے، دیارِ محبوب کی دھن میں بادہ پیائی ہورہی ہے:

در بیابانہا زِ شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

پہنچتے ہی مرکزِ تجلیات (کعبہ) پر نظر پڑی تو بے ساختہ دارِ محبوب کا طواف کرتا ہے، بار بار چکر لگاتا ہے، حجرِ اسود جو'' یمین اللّٰہ فی الأرض'' کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو چومتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے، ملتزم سے چمٹتا ہے، زاروقطار روتا ہے، گویا زبانِ حال سے کہتا ہے:

نازم بچشمِ خود کہ روئے تو دیدہ است
رفتم بپائے خویش کہ بکویت رسیدہ است
ہزار بار بوسہ زنم من دستِ خویش را
کہ بدامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس بے خود عاشقِ زار کو جو قلبِ تپاں اور جگرِ سوزاں لے کر آیا تھا، پہلی مہمانی کے طور پر ''آبِ زمزم'' کا تحفۂ شیریں پیش کیا جاتا ہے، جس سے تسکینِ قلب بھی ہوگی اور جگر کی پیاس بھی بجھے گی اور حکم ہوتا ہے کہ جتنا پانی پیا جاسکے پی لے، خوب دل ٹھنڈا کر لے، کوئی کسر نہ چھوڑ، یہاں سے فارغ ہوکر صفا ومروہ کے درمیان چکر لگاتا ہے، پھر منیٰ پہنچتا ہے، پھر اس کے آگے عرفات کا رُخ کرتا ہے۔ آج وادیِ عرفات سچ مچ ہنگامۂ محشر کا منظر پیش کررہی ہے، حیرت انگیز اجتماع ہے، رنگا رنگ مختلف شکلیں، مختلف زبانیں، بوقلموں مناظر، یہ سب رب العالمین کے دربارِ قدس کے مہمان ہیں، یہ

شاہی دربار میں عبدیت وبندگی، ضعف وبے کسی، عجز ودرماندگی اور ذلت ومسکنت کا نذرانہ پیش کریں گے اور رضا ومغفرت، فضل واحسان اور انعام واکرام کے گوہر مقصود سے جھولیاں بھر کر لے جائیں گے، اپنے لیے، اپنے اعزہ واقارب اور دوست احباب کے لیے آج جو کچھ مانگیں گے نقد ملے گا، زوال ہوا تو ہر چہار طرف سے آہ وبکا کا شور برپا ہوا، اس کی آواز بھی اس حیرت انگیز طوفانِ گریہ وزاری میں ڈوب گئی، شام تک کا سارا وقت اسی عالم تحیر میں گزارتا ہے، کبھی خوب رورو کر مانگتا ہے، کبھی ''لبیک اللّٰھم لبیک'' کا نعرہ لگاتا ہے، کبھی تکبیر کی گونج سے زمزمہ آراء ہوتا، کبھی تہلیل سے نغمہ سرا ہوتا ہے، کبھی ''لا إلٰه إلا اللّٰه وحدهٗ لاشریک لهٗ'' سے وحدانیت وربوبیت کی صدائیں بلند کرتا ہے، عابد ومعبود کا یہ تعلق کتنا دل ربا ہے؟! اور بندگی وسرافگندگی کا یہ منظر کس قدر حیرت افزا ہے؟!

آفتاب غروب ہوا اور اس دشت پیمانے بوریا بستر باندھ مزدلفہ کا رُخ کیا، شب بیداری وہاں ہوگی، مغرب وعشا کی نماز وہاں پڑھی جائے گی، اظہارِ آدابِ بندگی میں کچھ کسر باقی رہ گئی ہے تو وہاں نکالی جائے گی، کبھی رکوع وسجود ہے، کبھی وقوف وقیام ہے، کبھی تہلیل وتکبیر ہے، کبھی تسبیح وتلبیہ ہے۔ گریہ وزاری، دعا ومناجات اور تضرع وابتہال کا نصاب پورا ہوا تو کامیابی وکامرانی کی نعمت سے سرشار ہوکر وہاں سے منیٰ کو چلا، دشمنِ انسانیت، عدو مبین، راندۂ بارگاہ ابلیس لعین کی سرکوبی کے لیے جمرہ کی رمی کی، خلیلؑ وذبیحؑ (علیٰ نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام) کی سنتِ قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی دی اور رضائے محبوب کے لیے جان ومال کے ایثار وقربانی کا عہد تازہ کرلیا۔ وہاں سے بارگاہِ قدس کے مرکزِ انوار کی زیارت کو چلا اور طوافِ کعبہ کے انوار وبرکات سے دیدہ ودل کی تسکین کا سامان کیا۔

الغرض اس عاشقانہ ووالہانہ عبادت میں دیوانہ وار ایثار وقربانی اور عبدیت وفنائیت کا ریکارڈ قائم کرلیتا ہے اور تجلیاتِ ربانی کے انوار وبرکات سے سراپا نور بن جاتا ہے اور رحمت ورضوان کے تحفوں سے مالا مال ہوکر اور استحقاقِ جنت کی آخری سند لے کر اپنے وطن کو واپس لوٹتا ہے، اس طرح بندہ بندگی کا ثبوت دے کر جنت ورضوانِ الٰہی کی نعمتوں سے سرفرازی کے تمغے وصول کرلیتا ہے ''**والحج المبرور لیس له جزاء إلا الجنة**'' کے آخری انعام سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ دیکھئے! کس انداز سے عشق ومحبت کی منزلیں طے کی گئیں اور کس کس طرح شاباشوں سے نوازا گیا، یہ اس عاشقانہ وعارفانہ عبادت کا بہت ہی مختصر سا نقشہ ہے۔

سفرِ عشق میں امتحان

ظاہر ہے کہ مقصد بہت ہی اعلیٰ ہے، اس لیے کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لیے امتحان بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ مدتوں کے جمے ہوئے تہ بر تہ زنگ وغبار کو دور کرنے کے لیے شدید تنقیہ کی ضرورت پڑتی ہے، کبھی جان پر امتحان آتا ہے، کبھی مال پر، کبھی رفقاء سے تنہا کرا کر تڑپایا جاتا ہے، کبھی پٹوا کر رُلایا جاتا ہے، کبھی ہر آسائش وراحت چھین کر آخرت کی آسائش وراحت کی نعمت سے نوازا

جاتا ہے۔ بہرحال یہ راز سربستہ کسی کے بس کی بات نہیں، شانِ ربوبیت کے کریمانہ کرشمے ہیں، شانِ صمدیت کا ظہور اور ارحم الراحمین کی رحمتِ خفیہ کے شیون ہیں، رحمتِ الٰہی کا ظہور کبھی بصورتِ رحمت ہوتا ہے، کبھی بشکلِ زحمت، کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ عارفین جو دریائے معرفت کے غوطہ زن ہیں، وہ بھی سرِ حیرت جھکا کر خاموش ہیں، صبر آزما امتحان لیا جاتا ہے، کبھی جوع وخوف سے، کبھی انفس واموال زیرِ امتحان ہوتے ہیں، رضا بالقضاء کے لیے مجاہدہ کرایا جاتا ہے اور مہربانی اور شاباش کی بارش ہوتی اور آخر میں جنت کی سند مل جاتی ہے اور ''**الحج المبرور ليس لهٗ جزاء إلا الجنة**'' کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، بلاشبہ عبدیت کا ظہور اور شانِ عشق ومحبت کا مظاہرہ جس طرح حج بیت اللہ الحرام میں ہوتا ہے، کسی اور عبادت میں نہیں ہوتا۔

امسال سالِ گزشتہ یا گزشتہ سالوں کی بہ نسبت بے حد ہجوم تھا اور تقریباً نصف ملین (۵،۰۰،۰۰۰) خدا کی مخلوق زیادہ پہنچ گئی تھی، محدود مقامات اور محدود انتظامات میں غیر محدود مخلوق کا انتظام درہم برہم ہوگیا تھا، قیام وطعام کی دشواریاں تھیں، ٹریفک اور مواصلات کا نظام تقریباً بس سے باہر تھا، ایک ترکی قوم کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، جن کی دیوہیکل بسوں نے تمام حجاج کرام کو بے بس بنادیا تھا، سڑکیں بند، راستے مشغول، شاہ فیصل کے عہدِ مبارک کے شاہانہ انتظامات نے بھی عجز وتقصیر کا اعتراف کیا، اگرچہ قدم قدم پر حق تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کرم فرما تھی اور شاہ فیصل کے عہد کی برکات بالکل ظاہر و باہر تھیں، لیکن پھر بھی حکومتوں کا حج پر کنٹرول کرکے حجاج کے کوٹے مقرر کرکے تحدید کرنے کی مصلحتیں وحکمتیں تکوینی طرز پر واضح ہوگئیں، اس سلسلہ میں چند باتیں اور گزارشات ضروری خیال کرتا ہوں۔

حجاج کے لیے چند ضروری ہدایات

۱:......عورتوں اور مردوں کا ناگفتہ بہ اختلاط طوافوں میں، نمازوں میں اور سلام کی حاضری میں غیر شرعی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ عورتوں کے طواف کے لیے رات یا دن میں کوئی وقت مخصوص کرلیا جائے اور اس طرح سلام کی حاضری کے لیے بھی وقت مخصوص ہو، ان اوقات میں مردوں کو طواف یا حاضری سے روکا جائے۔

۲:......نہ تو عورتوں پر جماعت کی پابندی ہے، نہ مسجد کی حاضری کی فضیلت ہے، نہ نمازِ جمعہ ان پر فرض ہے، اس لیے عورتیں گھر میں نماز پڑھا کریں اور اسی طرح جمعہ میں عورتوں کی حاضری روکی جائے، موجودہ صورتِ حال نہ شرعاً درست ہے، نہ عقلاً قابل برداشت ہے۔

۳:......رمی جمرات کے لیے عورتیں رات کو جایا کریں، جس طرح بوڑھوں اور مریضوں

کے لیے بھی یہی وقت مناسب ہے، بلاشبہ بغیر عذر کے یہ خلافِ سنت ہے، لیکن موجودہ صورتِ حال میں ان شاء اللہ! کراہت بھی ختم ہوجائے گی۔

۴:......تمام حضرات جو حجِ بیت اللہ الحرام کا ارادہ کریں تمام مسائل یاد کرکے آئیں، فرائض وواجبات کا اہتمام بہت ضروری ہے، بسا اوقات یہ دیکھا گیا کہ لوگ فرائض وواجبات میں تقصیر کرتے ہیں اور فضائل ومستحبات کا اہتمام ہوتا ہے۔

اس وقت جو صورتِ حال ہے قانونی وفقہی احکام کے پیشِ نظر تو یہ امید رکھنا بہت مشکل ہے کہ یہ عبادت صحیح ادا ہوئی یا یہ حجِ مبرور ہوگا، صحیح طواف کیسے ہو؟ اور اس میں کیا کیا باریکیاں ہیں؟ اگر ایک قدم طواف کا ایسا ادا ہو کہ بیت اللہ کی طرف سینہ ہوجائے تو سارا طواف بیکار ہوگیا، اگر شروع کرنے میں حجرِ اسود سے تقدم ہوگیا تو طواف میں نقصان آجاتا ہے، اگر ایک انچ ہٹ کر طواف شروع کیا تو سرے سے طواف ہوا ہی نہیں، خاص کر ازدحام وہجوم میں صحیح طواف کرنا بے حد دشوار مرحلہ ہے۔ عورتیں مردوں کے درمیان کھڑی ہوجاتی ہیں، ایک عورت اگر صف میں مردوں کے درمیان کھڑی ہوگئی تو تین مردوں کی نماز غارت ہوگئی: جو شخص دائیں ہو، جو بائیں ہو، جو اس کی سیدھ میں پیچھے ہو، اگر ایک ہزار عورتیں اس طرح صفوں کے درمیان ہیں تو تین ہزار مردوں کی نماز فاسد ہوگئی۔ دورانِ سفر بہت سی نمازیں قضا ہوجاتی ہیں، اگر فرض نماز قضا ہوگئی تو حج مبرور کی توقع رکھنا مشکل ہے۔ الغرض اس طرح دسیوں مسائل ہیں کہ جن سے عوام تو کیا علماء بھی غافل ہیں۔ ''رمی جمرات'' میں معمولی عذر پر دوسروں کو وکیل بنایا جاتا ہے، اس طرح وہ توکیل صحیح نہیں ہوتی، دم لازم آجاتا ہے۔

غور کرنے سے محسوس ہوا کہ جہاں تک مسائل واحکام کا تعلق ہے، مشکل سے یہ کہا جائے گا کہ یہ حج صحیح ادا ہوگیا، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتِ کاملہ کے پیشِ نظر کوئی بعید نہیں کہ اگر نیت صحیح ہو اور جذبہ سچا ہو تو تمام کوتاہیاں اور قانونی فروگزاشتیں سب معاف ہوں اور ارحم الراحمین کی رحمتِ عامہ سے یہی امید ہے کہ اپنے گنہگار بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر فرما کر اپنی رحمت ونعمت سے نوازے اور نہ معلوم کس کی کونسی ادا قبول ہوجائے اور کیا کچھ خزانۂ رحمت سے ملے اور بلاشبہ حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتِ کاملہ کی موسلا دھار بارش میں کوئی بدنصیب ہی محروم رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ چند مقبولینِ بارگاہ کے طفیل سب کا حج قبول ہو، اس کی شانِ کریمی کے سامنے سب کچھ آسان ہے، کاش! اگر حق تعالیٰ کی اتنی مخلوق قانون کے مطابق جذباتِ صادقہ سے والہانہ انداز سے یہ فریضہ ادا کرتی تو امت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور تمام عالم میں ان نمائندگانِ بارگاہِ قدس کا فیض جاری ہوتا، جس حریمِ قدس کو ان شاندار کلمات سے وحیِ ربانی میں یاد کیا ہو:

''إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اٰيَاتٌ

بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا‘‘۔ (آل عمران:۹۶،۹۷)

ان آیاتِ بینات اوران برکات وتجلیات کا کیا ٹھکانا؟ بہرحال کہنا یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ قانون کی رو سے بھی صحیح حج ہو اور نیت وجذبہ بھی سچا ہو اور قدم قدم پر تقصیر کا احساس ہو اور یہ تصور مستمر قائم ہو کہ اس حریم قدس میں حاضری کے آداب کی اہلیت کہاں؟ ہم جیسے ناپاکوں کو اس سرزمین میں حاضری کی دعوت دی گئی اور پہنچ گئے، یہ محض حق تعالیٰ شانہٗ کا عظیم احسان ہے کہ اس مقدس زمین اور بقعۂ نور میں سراپا ظلمات والے کو جگہ عطا فرمادی، توقع ہے کہ اس احساس سے بارگاہِ قدس میں شرفِ قبولیت نصیب ہو۔

یہ جو کچھ بیت اللہ کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ بہت سطحی حقائق کے درجہ میں بات عرض کی گئی، ورنہ جو حقائق واسرار، عارفین وکبارِ صوفیاء کرام، شیخ اکبرؒ، امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت شیخ سید آدم بنوریؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جمیعاً نے بیان فرمائے ہیں، وہ ’’بینات‘‘ کے دائرۂ بیان سے بالاتر ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے رسالہ ’’**بغية الأريب في مسائل القبلة والمحاريب** ‘‘ کے آخر میں کچھ تھوڑا سا حصہ بیان کیا ہے۔

بہرحال کعبۃ اللہ اس مادی کائنات میں ’’شعائر اللہ‘‘ میں داخل ہے۔ نماز میں اگر حق تعالیٰ شانہٗ سے مناجات وہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو حج میں حق تعالیٰ کے گھر میں مہمانی کا شرف ومجد حاصل ہے، جب ہم کلامی کی عظمت بیت الحرام میں نصیب ہو اور دونوں عظمتیں جمع ہوجائیں تو جو کچھ بھی اس کا درجہ ہوگا، تصور وخیال سے بالاتر ہے:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہ وہ مقام ہے کہ انتہائی تعظیم وادب کی ضرورت ہے، لیکن آج کل ہماری غفلت وجہالت سے جو صورت حال ہے، وہ ظاہر ہے۔ افسوس یہ کہ ہماری تمام عبادات کی صرف صورت رہ گئی، روح نکل گئی ہے۔ تمام عبادات بے جان لاشے ہیں، اگر ان میں جان ہوتی تو آج امت محمدیہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، حق تعالیٰ کی رحمت ہے اور اسلام کا حکیمانہ نظام ہے کہ مساجد بھی بیوت اللہ ہیں: ’’وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا ‘‘ مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں، ان میں صرف اللہ ہی کی عبادت ہونی چاہیے، آخری سب سے بڑا مرکزی گھر وہ مسجد حرام بیت الحرام ہے، جس سے عالم میں بجز اس مقام کے جہاں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمارہے ہیں، کوئی مقدس قطعہ نہیں، جہاں پر حق تعالیٰ کی طرف سے انوار کی موسلا دھار بارش برستی ہے، فرشتے طواف کے لیے آسمانوں سے اترتے ہیں۔ حق تعالیٰ مسلمانوں اور حجاج کرام کو توفیق نصیب فرمائے کہ اس مقام کی صحیح معرفت نصیب ہو، بقدرِ طاقت بشری حق ادا کرسکیں۔

.....✽.....✽.....✽.....

انکارِ حدیث کیوں؟

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم، الحمد للّٰہ وسلامٌ علی عبادہٖ الذین اصطفٰی! اما بعد:

مذہب اسلام کے لیے موجودہ دور میں جو سوالات خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان میں حدیث نبوی (علی صاحبہا الف الف سلام) کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات بالخصوص توجہ طلب ہیں:

۱- حدیث کا مرتبہ اسلام میں کیا ہے؟

۲- حدیث سے شریعت اسلامیہ کو کیا فوائد حاصل ہوئے؟

۳- حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے تو اس سے دین کو کیا نقصان ہوگا؟ دورِ حاضر میں انکارِ حدیث کی جو وباء پھوٹ پڑی ہے، یہ کن جراثیم کا نتیجہ ہے؟

سطور ذیل میں ہم ان سوالات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ **واللّٰہ الموفق والمعین**

لیکن اصل سوالات پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم چند اصولی امور ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں، جن سے نظر وفکر کی مزید راہیں کھل سکیں۔

① - نبی امت کی عدالت میں

''انکارِ حدیث'' کا فتنہ ظہور میں آچکا ہے۔ بحث کرنے والے پوری قوت کے ساتھ اس بحث میں مصروف ہیں کہ حدیث حجت ہے یا نہیں؟ جن لوگوں کی طرف سے یہ بحث اٹھائی گئی ہے ان کا حال تو انہی کو معلوم ہوگا، لیکن جہاں تک میرے ایمان کا احساس ہے، یہ سوال ہی غیرتِ ایمانی کے خلاف چیلنج ہے جس سے اہل ایمان کی گردن ندامت کی وجہ سے جھک جانی چاہیے۔

اس فتنہ کے اٹھانے والے ظالموں نے نہیں سوچا کہ وہ اس سوال کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اعتماد یا عدم اعتماد کا فیصلہ طلب کرنے کے لیے امت کی عدالت میں لے آئیں گے۔ امت اگر یہ فیصلہ کردے گی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات (حدیث) قابل اعتماد ہے، تو اس کے مرتبہ کا سوال ہوگا اور اگر

نالائق امتی یہ فیصلہ صادر کردیں کہ ''نبی کریم ﷺ کی کوئی بات (حدیث) آپ کے زمانہ والوں کے لیے لائق اعتماد ہوتو ہو، لیکن موجودہ دور کے متمدن اور ترقی پسند افراد کو نبی ﷺ کی کسی حدیث پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرنا ملائیت ہے'' تو نبی اکرم ﷺ کے خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ ہو جائے گا۔ (معاذ اللہ، استغفر اللہ) اگر دل کے کسی گوشے میں ایمان کی کوئی رمق بھی موجود ہے تو کیا یہ سوال ہی موجبِ ندامت نہیں کہ نبی ﷺ کی بات لائق اعتماد ہے یا نہیں؟

تُف ہے! اس مہذب دنیا پر کہ جس ملک کی قومی اسمبلی میں صدرِ مملکت کی ذات کو تو زیر بحث نہیں لایا جاسکتا (پاکستان کی قومی اسمبلی کے اسپیکر نے متعدد دفعہ یہ رولنگ دی ہے کہ معزز ارکانِ اسمبلی صدرِ مملکت کی ذات گرامی کو زیر بحث نہیں لاسکتے) لیکن اسی ملک میں چند ننگ امت' آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس کو نہ صرف یہ کہ زیر بحث لاتے ہیں، بلکہ زبان وقلم کی تمام تر طاقت اس پر صرف کرتے ہیں کہ امت رسول اللہ ﷺ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دے ڈالے۔ اگر ایمان اسی کا نام ہے تو مجھے کہنا ہوگا: ''بِئْسَمَا یَأْمُرُکُمْ بِهٖ إِیْمَانُکُمْ إِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔''

بہرحال مریض دلوں کے لیے انکارِ حدیث کی خوراک لذیذ ہو تو ہو (غلبۂ صفراء کی وجہ سے ان مسکینوں کو اس کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا) لیکن میرے جیسے گنہگار اور ناکارہ اُمتی کے لیے یہ موضوع خوشگوار نہیں، بلکہ یہ بحث ہی تلخ ہے، نہایت تلخ!!!۔ مجھے کل ان کے دربار میں جانا ہے اور ان کی شفاعت کی امید ہی سرمایۂ زندگی ہے۔ سوچتا ہوں اور خدا کی قسم! کانپتا ہوں کہ اگر ان کی طرف سے دریافت کرلیا گیا کہ ''او نالائق! کیا میری حدیث کا اعتماد بھی محل بحث ہوسکتا ہے؟ تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ اسلام کے ان فرزندانِ ناخلف نے خود رسالت مآب ﷺ پر جرح وتعدیل کا جو راستہ اختیار کیا ہے واللہ! اس میں کفر ونفاق کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں، ''فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ'' (اب جس کا جی چاہے نبی کی بات پر ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے۔)

۲- فتنہ کی شدت

فتنہ کی کجی ملاحظہ کیجئے! دین قیم کے وہ صاف، واضح، روشن اور قطعی مسائل جن میں کل تک شک وتردد کا ادنیٰ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، کل تک ملت اسلامیہ جن کو یقینی مانتی چلی آئی تھی، شکی مزاج طبیعتیں آج ان ہی مسائل کو غلط اور ناقابل قبول ٹھہراتی ہیں۔

ایک رسول اکرم ﷺ کی ذات اب تک محفوظ تھی، تمام امت کا مرجع تھی، ہر امتی آنحضرت ﷺ کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا کرتا تھا، امت میں کوئی اختلاف رونما ہو، اس کے فیصلہ کے لیے آپ ﷺ کی ذات آخری عدالت تھی اور آپ ﷺ کا ہر فیصلہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن افسوس! آج کس کے پاس یہ شکایت لے جائیں کہ فتنہ کے سیلاب کی موجیں علماء، صلحاء، صوفیاء، متکلمین، محدثین،

مجتہدین، تابعین اور صحابہ رضی اللہ عنہم ان سب کو روندتی ہوئی دین وشریعت کی آخری فیصل ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹکرارہی ہیں اور چاہا جاتا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی اور سب سے آخری عدالت کو بھی مجروح کردیا جائے ،فإلی اللّٰہ المشتکٰی۔

اُف! مبتلائے فتنۂ امت میں یہ بحث موضوعِ سخن ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث حجت ہے یانہیں؟ دینی حیثیت سے قابل قبول ہے یانہیں؟ کیا یہ صاف اور موٹی بات بھی کسی کی عقل میں نہیں آسکتی کہ کسی ذات کو نبی اور رسول ماننا یا نہ ماننا تو ایک الگ بحث ہے، لیکن جس ذات کو رسول مان لیا جائے، ماننے والے کے ذمہ اس کی ہر بات کا مان لینا بھی ضروری ہے، جس کام کا وہ حکم کرے اس کی تعمیل بھی ماننے والے کے لیے لازم ہے اور جس فعل سے وہ منع کرے اس سے رُک جانا ضروری ہے۔

رسول کو رسول مان کر اس کے احکام میں تفتیش کرنا ’’کہ یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے دے رہے ہیں یا خدا کی طرف سے؟ اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے کوئی ارشاد فرماتے ہیں تو اس کی تعمیل سے معاف رکھا جائے۔‘‘ نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ کتنی صاف اور سیدھی بات تھی، لیکن نہیں معلوم لوگ عقل کو کہاں استعمال کیا کرتے ہیں کہ ایسے بدیہی امور میں بھی شک اور تردد کا مرض ان کو ایمان ویقین سے محروم کیے رکھتا ہے۔ شرح تحریر میں ہے:

’’حجیة السنة سواء کانت مفیدة للفرض أو الواجب أو غیرھما (ضرورة دینیة) کل من لهٗ عقل وتمییز حتی النساء والصبیان یعرف أن من ثبت نبوتهٗ صادق فیما یخبر عن اللّٰہ تعالٰی ویجب اتباعهٗ‘‘۔ (تیسیر التحریر، ج:۳،ص:۲۲)

ترجمہ:......’’سنت خواہ مفید فرض ہو یا واجب یا ان کے علاوہ کے لیے مفید ہو، اس کا حجت ہونا دین کا ایسا واضح مسئلہ ہے جس میں طلب دلیل کی ضرورت نہیں۔ جس کو ذرا بھی عقل وتمیز ہو، عورتوں اور بچوں تک بھی، وہ جانتا ہے کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بتلائے گا اس میں قطعاً سچا ہوگا اور اس کی بات کی پیروی واجب ہوگی۔‘‘

منکرین حدیث کی کورچشمی ملاحظہ کرو! اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ برحق ہیں، اس پر بھی اتفاق ہے کہ علم وعرفان کے سرچشمہ ہوتے ہیں، الغرض آفتاب طلوع ہو چکنے کے بعد' بحث اس پر ہو رہی ہے کہ سورج نکلنے کے بعد دن ہوتا ہے، یا رات ہوتی ہے؟ زبان وقلم، عقل وفہم اور دل ودماغ کی قوتیں اس پر صرف کی جارہی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے بعد اس کی کسی بات (حدیث) پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ جو خیرہ چشم طلوعِ آفتاب کا اقرار کرنے کے باوجود ’’دن نہیں رات ہے‘‘ کی رٹ لگا رہا ہو اور چاہتا ہو کہ تمام دنیا اسی کی طرح آنکھیں موند لے، بتلایا جائے کہ آپ ایسے سوفسطائی کو کس دلیل سے سمجھا سکتے ہیں؟!

اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کا زبانی اقرار کرنے والوں سے جب سنا جاتا ہے کہ جس ذات کو ہم رسول مانتے ہیں اسی کا کوئی قول اور فعل ہمارے لیے حجت نہیں تو بتلایئے! ایسے محرومانِ بصیرت کے لیے کونسا سامانِ ہدایت سودمند ہوسکتا ہے؟ کاش! ان کو چشم بصیرت نصیب ہوجاتی۔ ’’فَـإِنَّهَـا لَاتَـعْمٰـى الْـأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمٰى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِيْ الصُّدُوْرِ ‘‘......’’کیونکہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں، بلکہ وہ دل اندھے ہوچکے ہیں جو ان کے سینوں میں ہیں۔‘‘

۳-منکرین حدیث کی بے اصولی

حدیث کا جو ذخیرہ اس وقت امت کے پاس محفوظ ہے، اس کے دو جز ہیں: ۱......متن، ۲......سند، یعنی ایک تو حدیث کے وہ جملے ہیں جو قولاً یا فعلاً یا تقریراً صاحب حدیث ﷺ کی طرف منسوب ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا یا آپ نے فلاں عمل کرکے دکھایا یا آپ ﷺ نے فلاں کام کی جو آپ کے سامنے کیا گیا‘ تصویب فرمائی۔ دوم اساتذۂ حدیث کا وہ سلسلہ ہے جو امت اور امت کے نبی ﷺ کے درمیان واسطہ ہیں، مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ جس حدیث کو روایت کریں گے وہ ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے جائیں گے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث کن کن واسطوں سے ہم تک پہنچی۔

پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی حدیث جن لوگوں نے خود آپ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے سنی وہ سننے والوں کے حق میں اسی طرح قطعی تھی جس طرح قرآن کریم قطعی ہے۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جو حکم بھی صادر ہوا بالمشافہ سننے والوں کے لیے اس کا درجہ وحی خداوندی کا ہے اگر آپ نے اس کو قرآن میں لکھنے کا حکم دیا تو وہ وحی جلی کہلائے گا، ورنہ وحی خفی۔

قسم اول (وحی جلی) کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ تھے۔

قسم دوم (وحی خفی) کا مضمون منجانب اللہ ہوتا تھا، الفاظ آنحضرت ﷺ کے ہوتے تھے۔

بہر حال وحی کی یہ دونوں قسمیں چونکہ منجانب اللہ ہیں، اس لیے دونوں پر ایمان لانا اور دونوں کا قبول کرنا اہل ایمان کے ذمہ ضروری ہوا۔ البتہ روایتِ حدیث کے اعتبار سے حدیث کی مختلف قسمیں ہوجاتی ہیں جن کی تفصیل کو مع ان کے احکام کے اپنی جگہ بیان کیا گیا ہے۔

اب منکرین حدیث کی بے اصولی دیکھئے کہ وہ ان دونوں اجزاء (متنِ حدیث اور سندِ حدیث) کے متعلق مخلوط بحث کریں گے، حالانکہ بے اعتمادی کا زہر پھیلانے سے پہلے انصاف و دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ محل بحث کو طے کرلیا جاتا کہ کیا ان کو نفس حدیث ہی پر اعتماد نہیں خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو؟ یا نفس حدیث پر ان کو اعتماد ہے اور وہ اُسے دینی سند بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن موجودہ ذخیرۂ حدیث کے متعلق ان کی بے اعتمادی کا سبب یہ ہے کہ پوری امت میں ان کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس نے آنحضرت ﷺ کی یہ امانت امت تک صحیح پہنچادی ہو، اس لیے اس کو موجودہ ذخیرۂ حدیث سے ضد ہے،

مثلاً: امام مالکؒ کی وہ روایت جو مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبی ﷺ کی سند سے مروی ہیں، جو شخص ان روایات پر بے اعتمادی کا اظہار کرتا ہے، کیا اس کا فرض نہ ہوگا کہ وہ اپنی بداعتمادی کی وجہ بتلائے کہ آیا اسے حدیث کے ان تین ناقلین مالک، نافع، ابن عمرؓ پر ہی اعتماد نہیں- معاذ اللہ- یا خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر اعتماد نہیں!!! استغفر اللہ۔

بہر حال جب تک موضوع کی تنقیح اور تعیین نہ کرلی جائے، اس وقت تک کسی بھی مسئلہ پر بحث لغو اور لایعنی مشغلہ ہے، لیکن آپ منکرین حدیث کو پائیں گے کہ وہ کبھی نفس حدیث پر بحث کریں گے کہ محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں اور کبھی بے چارے ناقلین حدیث پر تبرا شروع کردیں گے کہ ان لوگوں نے امت کی یہ امانت بعد میں آنے والی امت تک کیوں پہنچائی، لیکن انکار حدیث کا منشأ متعین کرنے سے وہ گریز کریں گے۔ اس لیے میں کہوں گا کہ حدیث پر سے اعتماد اُٹھانے کا اصل حل تلاش کرو اور محل بحث تلاش کرنے کے بعد افہام وتفہیم کریں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ قصوروار ناقلین روایت ہوں اور فرد جرم خود حدیث پر عائد کردی جائے، یا اعتماد نفس حدیث پر نہ ہو اور اس کی سزا حدیث روایت کرنے والی پوری امت کو دی جانے لگے۔

۴- انکارِ حدیث کا عبرتناک انجام

حدیث پر اعتماد نہ کرنے والوں کو معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! ذاتِ نبوی ﷺ یا پوری امت میں سے ایک کو ناقابل اعتماد قرار دینا ہوگا ''استغفر اللہ'' آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ زید کا کلام عمرو نقل کرے، سننے والے کو زید کے صدق کا یقین ہو اور عمرو پر اعتماد ہو کہ وہ نقل میں جھوٹا نہیں، لیکن اس کے باوجود کہے کہ یہ کلام جھوٹا ہے۔ بہر حال یہاں یہ سوال کسی خاص حدیث کا نہیں، بلکہ مطلق حدیث کا ہے، جب اس کا انکار کیا جائے گا اور اُسے ناقابل اعتماد قرار دیا جائے گا تو اس صورت میں یا خود صاحب حدیث ﷺ کی ذات سے اعتماد اُٹھانا ہوگا یا پوری امت کو غلط کار اور دروغ گو کہنا ہوگا۔ انکارِ حدیث کی تیسری کوئی صورت نہیں اور ان دونوں کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اگر معاذ اللہ خود صاحب حدیث ﷺ یا چودہ سو سالہ اُمت سے اعتماد اُٹھا لیا جائے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ اسلام اور قرآن پر بھی ان کا اعتماد نہیں اور دین وایمان کے ساتھ بھی ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ ان حدیث رسول ﷺ کے متعلق بے اعتمادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال دل میں نہ لانا چاہیے کہ اس تمام ترسعی مذموم کے باوجود وہ اسلام اور قرآن کو بے اعتمادی کے جھگڑے سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مغرب کی اذان واقامت کے درمیان وقفہ کی حد

اورموجودہ طرزِعمل کا فقہی جائزہ!

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین، أما بعد!

’’عن الصنابحيؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لاتزال أمتي في مسکۃ من دینھا مالم ینتظروا المغرب اشتباک النجوم مضاھاۃ الیھود ومالم یؤخروا الفجر مضاھاۃ النصرانیۃ۔‘‘ (رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ ثقات، مجمع الزوائد، ج:۱، ص:۱۳)

وقال الشیخ ظفر أحمد العثماني رحمہ اللّٰہ في إعلائہٖ معزیا إلٰی الإمام النوويؒ: ’’وفي النیل: قال النووي في شرح مسلم: ’’إن تعجیل المغرب عقب غروب الشمس مجمع علیہ، قال: وقد حکي عن الشیعۃ فیہ لاالتفات إلیہ ولاأصل لہٗ، وأما الأحادیث الواردۃ في تأخیر المغرب إلٰی قرب سقوط الشفق فکانت لبیان جواز التاخیر وقد سبق إیضاح ذٰلک، لأنھا کانت جوابًا للسائل عن الوقت، وأحادیث التعجیل المذکورۃ في ھٰذا الباب وغیرہ إخبار عن عادۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المتکررۃ التي واظب علیھا إلا لعذر فالاعتماد علیھا. قولہ: عن الصنابحي.....الخ قلت: دلالتہ علٰی کراھۃ تاخیر المغرب ظاھرۃ۔‘‘

(اعلاء السنن، باب کراہۃ التاخیر فی المغرب وبیان حدہ، ج:۲، ص:۴۸، ط: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ)

مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ اگر ہونا چاہیے تو اس کی مقدار کتنی ہو؟ یہ ایسا بے غبار مسئلہ ہے کہ تمام فقہی مسالک میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے، اہل تشیع کے علاوہ تمام فقہاء' مغرب کی اذان واقامت کے درمیان خاطرخواہ تاخیر کو ’’تعجیل مغرب‘‘ کی سنت کے خلاف سمجھتے آرہے ہیں۔

فقہائے متقدمین کے ہاں ’’تعجیل مغرب‘‘ کے مسنون ودائمی عمل کی رعایت کی خاطر مغرب کی اذان واقامت کے درمیان رکعتین کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کا اختلاف' خود اس بات کا واضح بیان ہے

کہ فقہائے امت کی نظر میں اذانِ مغرب اور اقامت کے درمیان وقفہ کی گنجائش کتنی محدود ہے اور فقہائے احناف رکعتین کے وقفہ کو ''تعجیلِ مغرب'' کے مسنون دائمی عمل کے خلاف ہونے کی بنا پر ''تاخیرِ مغرب'' کا باعث شمار کرتے اور مکروہ قرار دیتے ہیں، اس حوالہ سے فقہائے احناف کا نقطۂ نظر جتنا واضح ہے، اتنا ہی ٹھوس، مدلل اور مبرہن بھی ہے، اگر کوئی حنفی طالب علم فقہائے احناف کے مسلک اور اس کی حدیثی بنیاد کو سمجھنا چاہے تو اس کے لیے علامہ ظفر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ کی ''اعلاء السنن'' کا ایک باب ''**باب کراھة التاخیر في المغرب وبیان حدہٖ**'' یا اس باب کی ایک حدیث متعلقہ افادات کے ساتھ بھی کافی ہے۔ درج بالا حدیث مبارک اور اس کی شرح میں مغرب کی اذان و اقامت کے درمیان وقفہ کا حکم، اس کی حد، تاخیر کے بیان پر مشتمل روایات کا محمل اور مغرب کی اذان و اقامت کے درمیان وقفہ کے اصل خوگر لوگوں کی مختصر الفاظ میں نشاندہی فرمائی گئی ہے۔

حدیث بالا اور اس کی شرح سے بنیادی پانچ امور مستفاد ہوتے ہیں:

①:......مغرب کی نماز سورج غروب ہوتے ہی بلا تاخیر پڑھنا آپ ﷺ کی عادتِ متکررہ اور دائمی عمل رہا ہے، کبھی کبھار تاخیر کسی عذر یا بیانِ وقت کے طور پر ہی منقول ہے۔

②:......مغرب کی نماز سورج غروب ہوتے ہی بلا انتظار پڑھنا امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے تمسک بالدین اور تدیّن کی امتیازی نشانی ہے، آسمان پر ستارے دکھائی دینے تک تاخیر کرنا یہود کی مشابہت ہے۔

③:......غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی مغرب کی نماز معتدبہ تاخیر کے بغیر شروع کر دینا' امت مسلمہ کا اجماعی معمول ہے، تاخیر کرنا اہل تشیع کا ناقابل التفات اور بے بنیاد عمل ہے۔

④:......جن حدیثوں میں ''شفق'' تک مغرب کی تاخیر کا ذکر ملتا ہے، وہ مجمع علیہ اور مطلوبہ تعجیل کو نظر انداز کرنے یا مطلوبہ تعجیل سے رخصت دلانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ ایسی روایات تو محض تاخیر کے جواز کو بتانے کے لیے ہیں، یا ایسی روایات مغرب کے وقت سے متعلق سوال کے جواب وارد ہوئی ہیں۔

⑤:...... علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث صنابحی ''تاخیر مغرب'' کے مکروہ ہونے پر واضح دلالت کرتی ہے۔

حدیثِ مذکور اور اس کی متعلقہ تفصیل کو زیر بحث مسئلہ کے بارے میں فقہائے احناف کے مسلک کی تلخیص کہنا بالکل بجا ہے۔ اذانِ مغرب اور اقامت کے درمیان خاطر خواہ وقفہ کو فقہائے احناف' آپ ﷺ کے دائمی عمل، مزاجِ شریعت اور اجماعِ امت کے خلاف ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دیتے ہیں اور فقہاء کے ہاں مطلق کراہت کا مدلول کراہت تحریمی ہوتا ہے۔ یہ تفصیل امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کی ''کتاب الاصل'' سے لے کر امام سرخسیؒ کی ''المبسوط''، علامہ کاسانی کی ''بدائع الصنائع''، ابن نجیم کی

''البحر الرائق'' اور ابن عابدینؒ کی ''ردالمحتار'' تک ہمارے فقہی ذخیرہ کی تمام معتمد ومتداول کتب میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ ان تمام کتابوں میں ''تعجیلِ مغرب'' کے منافی' تاخیر کی آخری حد ''رکعتین'' میں صرف ہونے والے وقت کو قرار دیا ہے، اس سے قبل سکتہ، وقفۂ یسیرہ، جلسۂ یسیرہ اور جلسہ بین الخطبتین کی حد کو اذان واقامت کے درمیان فاصلہ کی جائز اور مباح حد بتایا ہے اور بعض روایات سے تین آیات کی تلاوت میں صرف ہونے والے وقت کی مقدار وقفہ کو جائز اور مباح قرار دیا ہے۔ ہمارے بعض اکابر نے اذان خانہ سے امام کے پیچھے مصلی تک پہنچنے کے دورانیہ کو مغرب کی اذان واقامت کے درمیان فاصلہ کی حد قرار دیا ہے۔

فقہائے کرام کی تصریحات جہاں مغرب کی اذان واقامت کے درمیان' مباح یا مطلوب فاصلہ کا تعیّن کررہی ہیں، وہاں ان سے ''تعجیلِ مغرب'' کی دائمی سنت پر عمل کی بابت فقہائے احناف کی حساسیت بھی عیاں ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تین چھوٹی آیات کی حد اس لیے بتاتے ہیں کہ ''تعجیلِ مغرب'' کی سنت فوت نہ ہوجائے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ''سکتہ'' کی قید اس لیے لگاتے ہیں کہ کہیں تعجیل کے برعکس تاخیر مغرب لازم نہ آئے، دیگر فقہائے احناف جمعہ کے دوخطبوں کے درمیان جلسہ کا دورانیہ اس لیے ذکر فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ ''تاخیرِ مغرب'' کے زمرے میں جاسکتا ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فقہائے احناف ''تعجیلِ مغرب'' پر کتنے حریص ہیں اور تاخیرِ مغرب سے بچنے کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں!!

اس واضح حقیقت کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو فقہ حنفی کے پیروکاروں کے درمیان مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان ۲/۳ منٹ، پانچ منٹ یا آٹھ منٹ کا وقفہ تو دور کی بات ہے نفسِ سوال کی گنجائش بھی پیدا نہیں ہونی چاہیے تھی، مگر بعض حضرات نے عوام کی کسل مندی کو جواز بنا کر مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان (موصولہ اطلاعات کے مطابق) ۲ر منٹ سے لے کر آٹھ منٹ تک کے مستقل وقفے کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے، بلکہ اسے فقہ حنفی اور بعض اکابرِ دیوبند کے ہاں محقق عمل بھی کہہ گزرے ہیں، جس کی ادنیٰ توجیہ محض وہم یا علمی مغالطہ سے کی جاسکتی ہے۔

بنابریں مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان ۲ر منٹ یا اس سے زائد وقفے کا رواج ہمارے شہر کراچی یا ملک کے دیگر شہروں میں اس وقت رائج ہے، ہماری رائے میں یہ عمل کئی وجوہ سے جائز نہیں:

الف:...... مغرب کی اذان واقامت کے درمیان معتد بہ فاصلہ نہ کرنا بلکہ جلدی پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول ہے، مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان معتد بہ وقفے کو مستقل معمول بنانا سنت کے ترک اور خلافِ سنت کو معمول بنانے کے مترادف ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ سنت کے حکم

میں کبھی کبھار عذر کی بنا پر ترک کی گنجائش تو موجود ہے، لیکن ''ترکِ سنت'' کو دائمی معمول کا درجہ دینا وہ بھی دینی امر میں یہ معاملہ عمل سے نکل کر اعتقاد کے دائرے میں جا کر سنگین تر ہوسکتا ہے۔

ب:......مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان معتد بہ فاصلے کی ''حد'' فقہ حنفی کے اصول، متون، شروح سے لے کر عربی وار دو فتاویٰ تک صراحت کے ساتھ مذکور ہے، یعنی تین چھوٹی آیات کی تلاوت، یا دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار یا تین قدم چلنے کا دورانیہ تعجیل مغرب کے منافی نہیں ہے، اس دورانیہ کو فقہاء کے ہاں معتد بہ (خاطر خواہ) فاصلہ شمار نہیں کیا جاتا، اس سے زیادہ فاصلہ فقہائے کرام کے ہاں ایسا خاطر خواہ/ معتد بہ فاصلہ شمار ہوتا ہے جو تعجیلِ مغرب کے منافی اور تاخیر مغرب کا باعث بننے کی بنا پر ہمارے ائمہ کے ہاں مکروہ ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ نماز کے دوران کسی مکروہ عمل کو مستقل طور پر دہرانا یا نماز کی ادائیگی کے لیے کراہت کو معمول بنالینا نتیجۃً فسادِ صلوٰۃ پر بھی منتج ہوسکتا ہے، اگر نماز فاسد نہ بھی ہو تو ثواب میں کمی کا باعث تو بہر حال بنتا ہے۔ کیا اہل علم اس پر رضامند ہو سکتے ہیں کہ کاہل نمازیوں کی رعایت کی خاطر بروقت مسجد میں آنے والے نمازیوں کی نماز کو مستقل طور پر کراہت کی نذر کیا جائے؟! ہمارے خیال میں تو یہ ترجیح ورعایت کم از کم مغرب کی نماز میں تو شرعی مزاج کے خلاف ہے، شرعی مزاج تو یہ ہے کہ کاہلوں کی خاطر پابند نمازیوں کو انتظار نہ کرایا جائے۔

ج:...... تجربہ ومشاہدہ یہ ہے کہ کاہل اور سست لوگوں کو جتنی چھوٹ ملتی رہے وہ اتنا ہی سست ہوتے چلے جاتے ہیں، کاہلوں کی کاہلی میں معاون بننے کی بجائے ان کی چستی اور نشاط میں معاون بننا زیادہ ضروری ہے، ایسے لوگوں کو دو منٹ بعد میں آنے کی بجائے دو منٹ پہلے آنے پر رضامند وآمادہ کرنے کی ترغیب دینا دینی تقاضا ہے۔

د:......فقہائے امت اور اکابرِ ملت کے معمول سے ہٹ کر رائے زنی کا معمول معاملات اور معاشرت سے متعلق بعض امور میں تو ایک عرصہ سے رائج ہے، بعض اہل علم حالات کی مجبوری، عوام کی سہولت اور معاشرتی تقاضوں کو بنیاد بنا کر معاملات اور معاشرت سے متعلق بعض فقہی احکام میں بھی تن آسانی، سہولت کوشی اور رخصت فراہمی کی خدمات انجام دیتے چلے آرہے تھے، مگر ہمارے خطے میں کم از کم عبادات اس وبائے مسموم سے محفوظ تھیں، اب مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان وقفے کو سندِ جواز عطا کرنے کے عمل سے یہ جرأت عبادات میں بھی آگے بڑھ سکتی ہے اور تمام عبادات میں سہولت پسندی اور رخصت فراہمی کا سلسلہ بڑھنے کا شدید اندیشہ ہے، جو کہ ہمارے خیال میں فسادِ دین کا آخری درجہ ہوگا، ولاسمح اللّٰہ۔ پس سدِ ذرائع کے طور پر اس طرزِ عمل کو یہیں روک دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہ:......مغرب میں تعجیل کے منافی عمل (جو تاخیر کو مستلزم ہو) اُسے حدیثی اور فقہی نصوص میں یہود اور اہل تشیع کا طریقہ قرار دیا گیا ہے، اہل علم کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے تاخیری فتوے ہماری نمازوں کو یہودیوں

اور سبائیوں کی مشابہت یا اس کے قریب پہنچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اس لیے ہمیں اپنے ایسے فتووں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہمارے صلحاء وضع قطع لباس اور حلیے میں یہود ونصاریٰ کی مشابہت کو برداشت نہیں فرماتے تو عبادات میں ان کی مشابہت تک لے جانے والے راستہ کو اپنانا کہاں درست ہوسکتا ہے؟

بہرحال اذانِ مغرب اور اقامت کے درمیان مروجہ وقفہ فقہائے احناف کے ہاں بظاہر اتنا ہلکا نہیں تھا جتنا ہمارے بعض اہل علم نے سمجھا ہے۔

تمام اہل علم قابل قدر اور لائق صد احترام ہیں، لیکن اگر کسی صاحبِ علم کو اس سلسلے میں علمی مغالطہ ہوا تو انہیں مزید مراجعت فرمالینے کی ضرورت کا احساس ضرور ہونا چاہیے، تاکہ علمی خرابی اور عوامی تشویش سے بچا جاسکے۔

زیرِ بحث مسئلے میں علمی مغالطہ سے بچنے اور عوامی تشویش سے بچاؤ کی خاطر ''مرکز العلوم الاسلامیہ منگھوپیر کراچی'' کے مہتمم حضرت مولانا مفتی امداداللہ صاحب حفظہ اللہ نے یہ مجموعہ تیار کیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''اذانِ مغرب کے بعد مروجہ وقفہ کی شرعی حیثیت، قرآن وسنت کی روشنی میں''، اس مجموعہ میں مؤلف گرامی نے زیرِ بحث مسئلہ کی شرعی حیثیت کا ہمہ جہتی جائزہ لیا ہے، قرآن وسنت، آثارِ صحابہؓ، مذاہب اربعہ اور فقہائے احناف کے متقدمین ومتأخرین کے اقوال کی روشنی میں یہ تحقیقی کاوش پیش فرمائی ہے۔ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں مؤلف موصوف نے اذانِ مغرب اور اقامت کے درمیان وقفے سے متعلق ممکنہ مظان سے ایسا واضح حکم بیان کردیا ہے کہ فقہی طالب علم کے لیے کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائش نہیں چھوڑی، بالخصوص بعض اہل علم کی طرف سے محقق ابن ہمامؒ، حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارات اذانِ مغرب اور اقامت کے درمیان مروجہ وقفہ کے جواز کے لیے پیش فرمائی گئی تھیں، مؤلف نے ان عبارات سے متعلق مغالطہ یا غلط فہمی کا بڑے مؤدب انداز میں مسکت تحقیق کے ساتھ جواب دیا ہے۔

قارئین اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کم از کم یہ اطمینان ضرور حاصل فرمائیں گے کہ اذانِ مغرب کے بعد مروجہ وقفہ کم از کم فقہ حنفی کی رو سے خلافِ سنت اور مستقل معمول بنانا موجب کراہت ہے اور فقہ حنفی میں یہ حکم روزِ روشن کی طرح واضح ہے، جن حضرات نے اس سے ہٹ کر فتویٰ دیا ہے یا اس عمل کو اختیار فرمایا ہے تو وہ فتویٰ اور عمل کم از کم حنفی اکثریت والے پاکستان میں قابلِ اعتبار اور لائقِ اختیار نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ مؤلف محترم کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اُسے بارآور ثابت فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین!

وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

خطبۂ صدارت! حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

بموقع اجلاسِ تاسیسی مسلم نیشنل یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء مرسلۂ: مولانا محمد عابد

پسِ منظر

''برطانیہ نے بیسویں صدی کے شروع میں خلافتِ عثمانیہ ترکی کو کمزور اور پھر ختم کرنے کی خوفناک سازشیں شروع کردی تھیں، جب اس کے آثارِ بدظاہر ہونا شروع ہوئے تو متحدہ ہندوستان میں خلافت کی حمایت میں تحریکِ خلافت اور اس کو مؤثر بنانے کے لیے انگریزوں کے خلاف تحریکِ ترکِ موالات شروع ہوئی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جون ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا کی اسارت سے رہا ہوکر ہندوستان پہنچے تو آپ نے اس تحریک کی حمایت میں فتویٰ دیا، فتویٰ نقشِ حیات جلد دوم صفحہ نمبر: ۶۷۴ پر ہے، انہی ایام میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر خلافت کمیٹی نے آپ کو ''شیخ الہند'' کا خطاب دیا، ماشاء اللہ! اس کے بعد تو یہ مبارک لقب آپ کی پہچان ہی بن گیا۔

سرسید مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اُس وقت انگریزوں کی مکمل حمایت میں تھی، مگر اسی یونیورسٹی میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور ان کے ہمنواؤں کی قیادت میں ایک طبقہ انگریز کی غلامی سے بیزار تھا، اس نے تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اعلیٰ قیادت سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کی بنیاد پر تحریکِ ترکِ موالات کی حمایت کا مطالبہ کیا، مگر فرنگی کی پروردہ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اس سے انکار کردیا، یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ مولانا جوہرؒ کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اس انگریز دشمن طبقہ نے انگریز کے اثرات سے پاک متوازی طور پر ''مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ'' کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس کے تاسیسی اجلاس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی۔ آپؒ نے باوجود علالت ونقاہت کے یہ کہہ کر دعوت قبول فرمائی کہ ''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسے میں ضرور شریک ہوں گا'' چنانچہ آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور صدارت فرمائی۔ خطبۂ صدارت آپ کی طرف سے حضرت مولانا

شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد علی گڑھ سے دہلی تشریف لے گئے اور ایک ماہ بعد دارِ فانی سے کوچ کر گئے، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔ واضح ہو کہ اس نئی مسلم نیشنل یونیورسٹی کے چانسلر حکیم محمد اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ اور وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ بنائے گئے، بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' تجویز کیا اور پھر یہ اسی نام ہی سے معروف ومشہور ہوئی۔ اسی مناسبت سے بہت سے مقامات پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ذیل کے خطبۂ صدارت کی نسبت ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی تاسیس کی طرف کر دی گئی ہے۔ ۱۹۲۵ء میں یہ نئی یونیورسٹی، علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوگئی۔

یہ تفصیل ہم نے اس لیے ذکر کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا نام آتے ہی ذہن فوراً سرسید کی قائم کردہ یونیورسٹی کی جانب جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی میزبان یہی سرسید مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھی، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں، بلکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تو سرسید یونیورسٹی کے باغیوں کی سرپرستی اور ان کی نئی یونیورسٹی کی تاسیس کے لیے گئے تھے اور یہی لوگ حضرتؒ کے میزبان تھے۔ لیکن بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نئی مسلم نیشنل یونیورسٹی میں مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ جو طبقہ تھا وہ بھی اصلاً سرسید یونیورسٹی علی گڑھ ہی سے تھا، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جذبۂ حریت وسیاستِ شرعیہ کے اعتبار سے دیوبند اور علی گڑھ میں سیاسی قبلہ کی وحدت پیدا کر دی تھی، جس کے نتیجہ میں جدید طبقہ کی ایک تعداد نے تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور علماء کے قرب کی وجہ سے بہت سے ''مسٹر'' ''مولانا'' بن گئے۔ تفصیل ''علمائے حق'' جلد اول اور ''نقشِ حیات'' جلد دوم کے آخر میں ملاحظہ کریں۔ یہ خطبۂ صدارت ''علمائے حق'' جلد اول، صفحہ نمبر: ۱۷۱ میں ہے۔ واضح رہے کہ کتاب ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی پانچویں وچھٹی جلد ہی ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول و دوم'' سے معروف ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ آج تقریباً صدی بعد بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات مخلصین کے لیے رہبر ورا ہنما ہیں کہ باطل کی سرکوبی اور حق کی سربلندی کے لیے اخلاص وتقویٰ کے ساتھ اجتماعیت، شجاعت وحکمت کا ہونا بھی ضروری ہے، محمد عابد عفی عنہ۔

خطبۂ صدارت

''حامداً ومصلیاً: اما بعد! جلسوں کی عام روش کا اقتضا یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر، جو ایک نہایت ہی سرفروشانہ ایثار وشجاعانہ جد وجہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے، شکرگزاری اور منت پذیری کا اظہار کروں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ

چند وقیع اور شاندار الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتا اور نہ مجھ کو محض رسمی اور مصنوعی ممنونیت کی نمائش اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش کرسکتی ہے جو فی الحقیقت آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے، دو چار پھڑ پھڑ کرتے ہوئے جملے بلا شبہ عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کرسکتے ہیں، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درمان ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم و دائم جوش کی، نہایت صابرانہ ثباتِ قدم کی، دلیرانہ مگر عاقلانہ طریق عمل کی اور اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی۔ غرض ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش محمدی بننے کی۔

میں ہرگز آپ کے لیکچراروں اور فصیح اللسان تقریر کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرتا ہوں، کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جو چیز سوئے ہوئے دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زمانہ کی ''ہوا'' میں اول تموّج پیدا کرتی ہے وہ یہی دعوتِ حق کا غلغلہ ڈالنے والی زبان ہے، ہاں! اس قدر گزارش کرتا ہوں کہ تاوقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعی جمیلہ کا سچا جذبہ، اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح میں قوتِ عمل، اس کے ارادوں میں پختگی اور چستی نہ ہو، محض گرمجوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کرسکتیں:

و کیف الوصول إلٰی سعاد و دونها   قلل الجبال و دونهن حتوف

اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادیِ پُر خار کو آپ برہنہ پا ہوکر قطع کرنا چاہتے ہیں وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے، قدم قدم پر وہاں صعوبتوں کا سامنا ہے، طرح طرح کی بدنی، مالی اور جاہی مکروہات آپ کے دامنِ استقلال کو الجھانا چاہتے ہیں، لیکن حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ کے قائل کو اگر آپ خدا کا سچا رسول مانتے ہیں (اور ضرور مانتے ہیں) تو یقین رکھیے! کہ جس صحرائے پُرخار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے راستہ پر جنت کا دروازہ بہت ہی نزدیک ہے۔

کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دکھائی دیا ہے:

''أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَ الضَّرَّاءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ أَلَاۤ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔'' (سورۃ البقرہ:۲۱۴)

''کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں جا گھسو گے اور تمہیں اس طرح کے حالات پیش نہ آئیں گے جو کہ تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئے؟ ان کو سختیاں اور اذیتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ مومنین بول اُٹھے کہ خدا کی مدد کہاں ہے؟ یاد رکھو کہ خدا کی مدد نزدیک ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصَّابِرِيْنَ۔'' (سورۃ آل عمران:۱۴۲)

''کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے بدون (بغیر) اس کے کہ اللہ جانچ کرے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کی؟۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

''الٓمٓ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْا أَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ۔'' (سورۃ العنکبوت:۱-۳)

''کیا لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ محض ''اٰمَنَّا'' کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے؟ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے، تو ضرور ہے کہ اللہ پرکھے گا سچے اور جھوٹے لوگوں کو۔''

یہ حق تعالیٰ جل شانہ کی سنت مستمرہ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی وتغیر گوارا نہیں، کوئی قوم اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے راستے پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی جس کو امتحان وآزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو، خدا کے برگزیدہ اور اولوالعزم پیغمبر جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہوسکتا، وہ بھی مستثنیٰ نہیں رہے، بیشک ان کو مظفر ومنصور کیا گیا، مگر کب؟! سخت ابتلاء اور زلزالِ شدید کے بعد، وہ خود فرماتے ہیں:

''حَتّٰى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاءَ هُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ وَ لَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۔'' (یوسف:۱۱۰)

پس اے فرزندانِ توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیاء ومرسلین اور ان کے وارثوں کے راستہ پر چلیں اور جو لڑائی اس وقت شیطان کی ذریت اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے اس میں ہمت نہ ہاریں اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوند قدیر کی امداد کے سامنے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

''أَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔'' (النساء:۷۶)

''ایماندار تو خدا کے راستے میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کے راستہ میں، پس تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو، بلاشبہ شیطان کی فریب کاری محض لچر پوچ ہے۔''

میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع ① کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔

بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا! اُٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ، ان کے دلوں پر

خوف وہراس مسلط ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا، حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاعِ قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی، چنانچہ اس قسم کے مضمون کی طرف حق تعالیٰ جل شانہ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا ہے:

''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَ أَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَ آتُوْا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَّ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْ لَا أَخَّرْتَنَا إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا أَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ۔'' (النساء:۷۷)

''کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوۃ دیتے رہو، پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو یکا یک ان میں ایک فریق ڈرنے لگا آدمیوں سے، خدا کے برابر یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگا: اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا؟ اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اور مہلت نہ دی؟ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے، جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، جہاں کہیں بھی تم ہو موت تم کو آدبائے گی، اگر چہ تم نہایت مستحکم قلعوں میں ہو۔''

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں، خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں[۲] تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اسی طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا، کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ[۳] میری طرف آیا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در مے خانہ زدند — گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنانِ حرم سرّ عفاف ملکوت — بہ امن راہ نشیں بادۂ مستانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد — حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا،

ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا ''حکومتِ وقتیہ'' کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے، اب از راہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے اور کیا یہ وہی بات نہیں جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ: ''ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھی، صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو۔''

باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی ہے کہ وہ اپنے نفع وضرر کا موازنہ کریں اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی ''بھپکے'' کے ذریعہ سے علیحدہ کر لیں، آج ہم وہی بھپکا نصب کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ ''بھپکا''، مسلم نیشنل یونیورسٹی ہے۔

مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہ رہی، کیونکہ زمانے نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی اور تدبر اور ہوش مندی کے پودے نشو ونما پاتے ہیں اور اس کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستے پر چل سکتا ہے، ہاں! ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو............. کیا باعتبارِ عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبارِ اخلاق واعمال کے اور کیا باعتبارِ اوضاع واطوار کے (ان سب میں) ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں پر غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے بیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ایک اسلامی حکومت کے ہاتھوں رکھی گئی ہے تو اس دن علماء نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا تھا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا............ تو کیا آپ ایک ایسی یونیورسٹی④ سے فلاحِ قومی کی امید رکھ سکتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا زبردست ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے.......... بلا شبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلبہ اپنے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے، اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک

آزاد یونیورسٹی⑤ کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

مجھے ان لیڈروں سے زیادہ ان نونہالانِ وطن کی ہمتِ بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے، جنہوں نے اس مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کے طمع اور خوف کے وہ ''موالاتِ نصاریٰ کے ترک'' پر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔

شاید ترکِ موالات کے ذکر پر آپ اس مسئلہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان عامة الورود سوالات اور شبہات کے دلدل میں پھنسنے لگیں جو اس بہت ہی اہم و اعظم مسئلے کے متعلق آج کل عموماً زبان زد ہیں، اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑا سا وقت مجھ کو اس تحریر کے سنانے کے لیے عنایت فرمائیں جو میں نے بعض مسائل دریافت کیے جانے پر دیوبند سے تیار کر کے بھیجی تھی۔⑥

اب میری یہ التجا ہے کہ آپ سب حضرات بارگاہِ رب العزت میں نہایت صدقِ دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رسوا نہ کرے اور ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنائے اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائیں۔

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد و آلہٖ وأصحابہٖ أجمعین

آپ کا خیر اندیش

محمود عفی عنہ

۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء

حواشی

①....حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ''گم شدہ متاع'' سے مراد شجاعت وجذبۂ حریت اور سیاسی شعور کی بیداری تھی، دراصل آپؒ مسلمانوں میں خصوصاً صلحاء وعلماء میں اعمالِ صالحہ کے ساتھ جذبۂ حریت کی سرشاری بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (م، ع)

②....اس لیے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی ''علی برادران'' کی قیادت میں تحریکِ خلافت میں جاں نثاری ملاحظہ فرمائی تھی۔

③....اس لیے کہ علی گڑھ کے ان لوگوں نے انگریز کے تسلط سے آزاد یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور تحریکِ ترکِ موالات میں حصہ لیا۔

④....یہ اشارہ ہے سرسید یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف۔

⑤....مراد مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ہے، جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تبدیل ہو گئی۔

⑥.... تحریکِ ترکِ موالات کے متعلق حضرت اقدس شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ نقشِ حیات صفحہ: ۶۷۴ جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں، جس کی تائید بعد میں پانچ سو علماء نے فرمائی تھی۔

فنِ جرح وتعدیل کی ابتدا اور ارتقا

ایک طائرانہ نظر

مولوی عبداللہ بن مسعود

اُمتِ مسلمہ کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے اپنے علوم کی نسل در نسل اشاعت وتبلیغ میں انتہائی حزم واحتیاط سے کام لیا ہے، ہر دور اور ہر طبقہ میں ایسے رجالِ کار پیدا ہوتے رہے ہیں، جنہوں نے ہر شعبۂ علم میں کھرے اور کھوٹے کو، دخیل اور اصیل کو ممتاز کرکے اس کے مابین فرق کو امت پر آشکارا کیا ہے۔ اس بات کا نہ صرف علم حدیث میں، بلکہ تمام علوم وفنون میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

گویا یہ مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گیا تھا کہ جو علمی بات کسی کے سامنے کی جاتی وہ پوری سند کے ساتھ کہی جاتی، حتیٰ کہ چھوٹے کلمہ کے نقل میں بھی اس کی رعایت کی جاتی تھی، تفسیر کی پرانی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں، تفسیر طبری کو ہی دیکھ لیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ اس میں ہر بات اور تفسیر سے متعلق ہر جملہ پوری سند کے ساتھ بیان ہوا ہے، اِلا یہ کہ وہ بات ابن جریر طبریؒ کی اپنی رائے ہو، اسی طرح سیرت کی پرانی کتابوں میں بھی اس کا التزام کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ ادب، شعر، لغت ان سب کی سندیں بھی موجود ہیں، ابوالفرج اصبہانی کی کتاب ''الأغانی'' اور المفضل الضبی کا اشعار کی سند ذکر کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے۔

اسناد کا اہتمام دوسرے علوم کی بنسبت علمِ حدیث میں زیادہ کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست شریعت کے ساتھ ہے، بلکہ کلام اللہ کے بعد احکام کے واسطے یہ بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی وجہ سے علماء فن نے ہر ہر حدیث کی سند پر مستقل کلام کیا ہے اور اس میں موجود ہر فرد کی مکمل جانچ پڑتال کی ہے، اس کی عدالت، حافظہ، اس کی چال چلن، مشاغل، وہ کس تخیل اور کس مشرب کا تھا، اس کے شیوخ اور اساتذہ کون تھے، غرض ان سب باتوں کا جائزہ لیا جاتا، تاکہ جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق روایتِ حدیث میں اس کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکے اور نبوی شہ پاروں کو کذب وافترا کی آمیزش سے پاک رکھا جاسکے۔

جرح وتعدیل کا تصور اور اس کا ثبوت بقول استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی دامت برکاتہم کے ''عہدِ رسالت ہی سے مل جاتا ہے۔'' بخاریؒ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کسی کو برا بھلا کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جرح کرتے ہوئے فرمایا: ''إنک امرؤ فیک جاهلية'' کہ... ''تمہارے اندر تو جاہلیت کی بو پائی جاتی ہے۔'' (بخاری، ج:۱،ص:۲۱، حدیث نمبر:۳۰، دار ابن کثیر)

اسی طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر جرح کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''أفتان أنت یا معاذ؟!'' کہ لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتے ہو اے معاذ!۔'' (مسند احمد، ج:۱۱،ص:۳۷۹، رقم:۱۴۱۲۴) بلکہ بعض معہود الفاظِ جرح وتعدیل کا استعمال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسے کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لیسوا بشیئ'' (بخاری، ج:۵،ص:۲۲۹۴، رقم:۵۸۵۹، دار ابن کثیر) اسی طرح واقعۂ افک میں آپ علیہ السلام نے اپنے گھر والوں کی تعدیل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''فواللّٰہ ما علمت من أهلی إلا خیراً'' کہ... ''بخدا! مجھے تو اپنے گھر والوں کے بارے میں بھلائی کے سوا کسی بات کی توقع نہیں ہے۔'' (المصطلح الحدیثی من خلال کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم، تالیف: دکتور عبدالرحمٰن، ص:۱۴۱) اور اسی قبیل سے آپ علیہ السلام کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ مقولہ بھی ہے کہ ''ما حدثکم ابن مسعودؓ فاقبلوه'' اور دوسری روایت میں ''فصدقوه'' کہ ''ابن مسعودؓ جس بات کی خبر دیں اس کو قبول کرلو'' یا دوسری روایت کے مطابق ''اس کی تصدیق کرو۔ (مسند ابی یعلی، ج:۱۶،ص:۶۰۷، رقم:۲۳۱۶۹، کنز العمال رقم:۳۳۱۱۷) اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی سچائی اور صدق گوئی سے متعلق ''ما أخللت الخضراء ولا أقلت الغبراء من ذی لهجة أصدق من أبی ذرؓ ''۔ (مسند احمد، ج:۱۶،ص:۴۷، رقم:۲۱۶۲۱) فرمایا، اس قول میں بھی ان کی تعدیل کی اور مذکورا لصدر مثالیں عہدِ رسالت میں جرح کے تصور کی واضح اور روشن مثالیں ہیں جن میں جرح وتعدیل کا صدور ہمیں لسانِ نبوی سے ہوتا نظر آتا ہے۔

اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر صحابہ کرامؓ کی زندگیوں اور ان کے احوال کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی جرح وتعدیل کے مظاہر نظر آسکتے ہیں، کیونکہ ان سے بھی جرح وتعدیل ثابت ہے، جیسے کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''معرفة علوم الحدیث'' ص:۵۲ میں صراحت فرمائی ہے کہ ''أبوبکرؓ وعمرؓ وعلیؓ وزید بن ثابتؓ جرحوا وعدلوا'' بطورِ نمونہ چند مثالیں جن کی طرف حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی مدظلہٗ نے رہنمائی فرمائی یہاں ذکر کردیتا ہوں:

① - بخاری کی روایت میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے ''إنک لتصل الرحم'' کہ... ''آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں'' جیسے توصیفی وتعدیلی جملے ارشاد فرما کر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی خوبیوں کو نمایاں کیا۔ (بخاری، ج:۱،ص:۵،رقم:۳،دارابن کثیر)

۲- فتنۂ ارتداد کے موقع پر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کچھ نرمی کی سفارش کی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جرح کرتے ہوئے ایک سخت جملہ ارشاد فرمایا: ''**جبار فی الجاهلية خوار فی الإسلام**'' کہ...'' جاہلیت میں تو بڑے سخت گیر تھے اور اسلام میں یہ حال ہے۔'' (تاریخ الاسلام للذہبی، ج:۱،ص:۳۲۱)

۳- صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نوف بکالی کی تکذیب کرتے ہوئے اس پر جرح کی کہ ''**كذب عدوُّ الله**''...'' اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا۔'' (المنہج الاسلامی فی الجرح والتعدیل،ص:۲۶،تالیف: أ.د فاروق حمادة)

اسی طرح راویوں کی تفتیش اور ان کی جرح وتعدیل کا یہ سلسلہ عہدِ صحابہؓ کے بعد بھی طبقہ در طبقہ جاری رہا اور علماء اُمت حق گوئی وبے باکی کے ساتھ بلاخوف وخطر بر ملا حق کا اظہار کرتے رہے، جس میں انہوں نے کسی بھی قسم کی قرابت داری اور معاشرتی دباؤ کا لحاظ نہیں کیا، حتیٰ کہ جب علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے والد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے سر جھکا لیا اور فرمایا: ''یہ معاملہ دین کا ہے، وہ ضعیف ہیں۔'' اسی طرح امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ: ''وہ کذاب ہے'' (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاویؒ،ص:۶۶) لہٰذا یہ ان علماء امت کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کسی بھی قسم کی قربانی سے کوتاہی نہیں کی اور ہر ہر راوی کو جرح وتعدیل کے اصولوں پر پرکھ کر اُمت پر روایتِ حدیث میں ان کی حیثیت کو آشکارا کیا، اب یہاں پر سنتِ نبوی کے ان خدام کا اور امت کے ان روشن ستاروں کا بترتیبِ زمانہ اختصاراً ذکر کیا جاتا ہے:

تابعین میں:

۱- سعید بن مسیّبؒ (۹۴ھ)
۲- شعبیؒ (۱۰۳ھ)
۳- زہریؒ (۱۲۴ھ)
۴- امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ)

دوسری صدی میں:

۱- امام اوزاعیؒ (۱۵۷ھ)
۲- شعبہؒ (۱۶۰ھ)
۳- سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ)
۴- امام مالکؒ (۱۷۹ھ)
۵- یحییٰ بن سعید قطانؒ (۱۹۸ھ)
۶- عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (۱۹۸ھ)

تیسری صدی میں:

۱- امام شافعیؒ (۲۰۴ھ)
۲- یحییٰ بن معینؒ (۲۳۳ھ)

③-علی بن مدینیؒ (۲۳۴ھ) ④-احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ)
⑤-امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) ⑥-امام مسلمؒ (۲۶۱ھ)
⑦-ابوزرعہ رازیؒ (۲۶۴ھ) ⑧-ابوحاتم رازیؒ (۲۷۷ھ)

چوتھی صدی میں:

①-امام نسائیؒ (۳۰۳ھ) ②-ابن ابی حاتم رازیؒ (۳۲۷ھ)
③-ابن حبان بستیؒ (۳۵۴ھ) ④-دار قطنیؒ (۳۸۵ھ)

پانچویں صدی میں:

①-ابوعبداللہ حاکمؒ (۴۰۵ھ) ②-خطیب بغدادیؒ (۴۶۳ھ)
③-ابن عبدالبرؒ (۴۶۳ھ)

چھٹی صدی میں:

①-عبدالحق اشبیلیؒ (۵۸۱ھ) ②-ابوبکر حازمیؒ (۵۸۴ھ)
③-ابن الجوزیؒ (۵۹۷ھ)

ساتویں صدی میں:

①-ابن نقطہؒ (۶۲۹ھ) ②-ابن الصلاحؒ (۶۴۳ھ)

آٹھویں صدی میں:

①-ابن دقیق العیدؒ (۷۰۲ھ) ②-ابوالحجاج مزیؒ (۷۴۲ھ)
③-ابوعبداللہ ذہبیؒ (۷۴۸ھ)

نویں صدی میں:

①-زین الدین عراقیؒ (۸۰۶ھ) ②-ابن حجرؒ (۸۵۲ھ)
③-بدرالدین عینیؒ (۸۵۵ھ) (المتکلمون فی الرجال للسخاوی، جرح وتعدیل، ڈاکٹر اقبال احمد محمد اسحاق، ص:۲۵۴)

یہ ان درخشندہ ستاروں میں سے چند کے اسماء کی نشاندہی تھی جن کی محنتوں اور کاوشوں کی بدولت آج یہ دین ہم تک بحفاظت پہنچا ہے اور یہ ان کا ایسا عظیم علمی کارنامہ ہے جس کی اقوامِ عالم میں نظیر نہیں ملتی۔ پھر امت کے نفوسِ قدسیہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ رواۃِ حدیث پر ائمہ جرح وتعدیل کا جو کلام تھا اس کو مختلف شکلوں میں جمع بھی کر دیا، اس طرح جرح وتعدیل سے متعلق عالم کتب میں مختلف النوع مصنفات وجود میں آ گئیں، بعض تو صرف ضعیف راویوں پر مشتمل تھیں، بعض نے ثقہ راویوں سے متعلق کلام کو جمع کیا، بعض نے دونوں کو اکٹھا کر کے تصنیفات کیں، بعض نے ضعف کی خاص صورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابیں لکھیں، بعض نے کسی خاص کتاب کو پیشِ نظر رکھا اور اس کے رجال

سے متعلق کلام کو زینتِ قرطاس بنایا اور بعض کتب سوال و جواب کے طرز پر وجود میں آئیں، ان کا ان شاء اللہ! چند سطور کے بعد مختصر تذکرہ مستقلاً کیا جائے گا۔

امام جرح وتعدیل علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ (۷۴۸ھ) کے تجزیہ کے مطابق جرح وتعدیل سے متعلق سب سے پہلے جس شخصیت کے کلام کو جمع کیا گیا وہ یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۸ھ) ہیں، چنانچہ وہ اپنی مشہور کتاب ''میزان الاعتدال'' ج:۱، ص:۴۵ میں رقم طراز ہیں: ''**أول من جمع کلامہ فی الجرح والتعدیل الإمام یحییٰ بن سعید القطان**'' اور امام موصوف حنفی مسلک کے پیروکار تھے جس کی شہادت علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یوں ہے کہ: ''**وکان فی الفروع علی مذہب أبی حنیفۃ**'' (سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ، ج:۹، ص:۱۷۶) ترجمہ: ''موصوف فروعی مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر تھے۔'' بلکہ یحییٰ بن سعید قطان رحمۃ اللہ علیہ سے بھی پہلے لیث بن سعدؒ (۱۷۵ھ) کی رجال سے متعلق ایک کتاب ''التاریخ'' کا ذکر ملتا ہے جس کو ابن ندیمؒ نے اپنی کتاب ''الفہرست'' (ص:۱۹۹) میں ذکر کیا ہے اور یہ موصوف بھی مذہباً حنفی تھے اور ان کا بھی امام اعظمؒ کے تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔ (عقود الجمان، الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ، ج:۱، ص:۵۲) لہٰذا اب یہ کہنا بلاشبہ درست ہوگا کہ فقہائے احناف کو فقہ کے ساتھ ساتھ فنِ جرح وتعدیل میں بھی تفوق وتقدم حاصل ہے۔

فن جرح وتعدیل میں ابتداءً جو تصنیفات کی گئیں وہ ضعیف راویوں کے حالات پر مشتمل تھیں یا ان میں ضعیف اور ثقہ راویوں کو اکٹھا کرکے ذکر کیا جاتا، صرف ثقہ اور معتمد راویوں پر مشتمل تصانیف ابتدائی زمانہ میں کم تھیں، چنانچہ پانچویں صدی کے اواخر تک صرف ضعفاء سے متعلق کتب کی تعداد تقریباً (۲۹) تھی اور جمع کے طریق پر لکھی جانے والی کتب اس عرصہ میں (۴۱) تک پہنچ گئی تھیں، جبکہ صرف ثقات پر مشتمل مصنفات اس دور میں انتہائی کم جن کی تعداد (۷) کے قریب بتائی جاتی ہے۔ (بحوث فی السنۃ المشرفۃ للدکتور اکرم العمری، ص:۱۱۵)

اب یہاں فن جرح وتعدیل سے متعلق مختلف النوع تصنیفات میں سے چند کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

① -ضعفاء پر مشتمل کتب:

۱-الضعفاء لیحیی بن معینؒ (۲۳۳ھ)
۲-الضعفاء لعلی بن المدینیؒ (۲۳۴ھ)
۳-الضعفاء لعمرو بن علی الفلاسؒ (۲۴۹ھ)
۴-الضعفاء لمحمد بن عبداللہ البرقیؒ (۲۴۹ھ)
۵-الضعفاء الکبیر والضعفاء الصغیر للبخاریؒ (۲۵۶ھ)
۶-الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدیؒ (۳۶۵ھ)
۷-میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبیؒ (۷۴۸ھ)

۲- ثقات پر مشتمل کتب:

۱- الثقات والمتثبتون لعلی بن المدینیؒ۔ (۲۳۴ھ) ۲- کتاب الثقات لأبی الحسن احمد العجلیؒ (۲۶۱ھ)
۳- الثقات لأبی العرب احمد بن محمد التمیمیؒ (۳۳۳ھ) ۴- کتاب الثقات اور
۵- مشاہیر علماء الأمصار، یہ دونوں ابن حبانؒ (۳۵۴ھ) بستی کی تالیف ہیں۔
۶- الثقات لأبی حفص عمر السکریؒ (۳۶۷ھ)
۷- تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنہم العلم لابن شاہین الواعظؒ (۳۸۵ھ)
۸- المدخل إلی الصحیحین لأبی عبداللہ الحاکمؒ (۴۰۵ھ)

اس کے بعد اس نوع کی تالیفات میں انقطاع آ گیا، پھر آٹھویں صدی ہجری میں متاخرین میں سے محمد بن ایبکؒ (۷۴۴ھ) نے ثقات پر مشتمل ایک کتاب لکھی لیکن وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی، حافظ سخاویؒ کے بیان کے مطابق اگر وہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو ۲۰ سے زائد جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاویؒ، ص:۱۰۹) حافظ ذہبیؒ نے بھی اس نوع سے متعلق ایک کتاب تالیف کی جس کا نام ''رسالة فی الرواة الثقات'' ہے، اسی طرح ابن حجرؒ کی بھی اس حوالے سے ایک تالیف ہے جو مکمل نہ ہوسکی اور ان کے شاگرد قاسم ابن قطلو بغاؒ نے بھی اس نوع میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ (بحوث فی السنۃ المشرفۃ، ص:۱۱۷)

۳- جمع کے طرز پر لکھی گئی کتب:

۱- التاریخ، تالیف: لیث بن سعدؒ (۱۷۵ھ) ۲- التاریخ، تالیف: عبداللہ بن مبارکؒ (۱۸۱ھ)
۳- التاریخ، تالیف: ضمرۃ بن ربیعۃؒ (۲۰۲ھ) ۴- التاریخ، تالیف: ابونعیم الفضل بن دکینؒ (۲۱۸ھ)
۵- الطبقات الکبری، تالیف: محمد بن سعدؒ (۲۳۰ھ) ۶- معرفۃ الرجال، تالیف: یحیی بن معینؒ (۲۳۳ھ)
۷- التاریخ، تالیف: یحیی بن معینؒ (۲۳۳ھ) ۸- التاریخ، تالیف: علی بن مدینیؒ (۲۳۴ھ)
۹- العلل ومعرفۃ الرجال، تالیف: احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) ۱۰- التاریخ الکبیر، تالیف: بخاریؒ (۲۵۶ھ)
۱۱- رواۃ الاعتبار، تالیف: مسلمؒ (۲۶۱ھ)
۱۲- ثقات المحدثین وضعفائہم، تالیف: ابوالعرب محمد ابن احمد القیروانیؒ (۳۳۳ھ)

۴- خاص رجال یا خاص کتب کے رواۃ سے متعلق چند تالیفات پر ایک طائرانہ نظر:

۱- التعریف برجال الموطأ، تالیف: ابوزکریا یحییٰ القرطبیؒ (۲۵۹ھ)
۲- رجال عروۃ، تالیف: مسلمؒ
۳- تسمیۃ رجال عبداللہ بن وہب، تالیف: محمد بن وضاحؒ (۲۸۷ھ)

۴-اسماء من روی عنہم البخاریؒ، تالیف: عبداللہ بن عدی الجرجانیؒ (۳۶۵ھ)
☆موصوف پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے بخاری کے رجال سے متعلق قلم اٹھایا۔
۵-ذکر اسماء التابعین ومن بعدہم ممن صحت روایۃً من الثقات عند البخاری، تالیف: دارقطنیؒ (۳۸۵ھ)
۶-المعجم المشتمل علی ذکر اسماء شیوخ الأئمۃ النبل، تالیف: ابن عساکرؒ (۵۷۱ھ)، یہ کتاب ائمہ ستہ کے شیوخ سے متعلق پہلی کتاب ہے۔ (مقدمہ علی تہذیب الکمال، د. بشار عواد معروف، ص:۳۷)
۷-الکمال تالیف: عبدالغنی المقدسی (۶۰۰ھ) موصوف کی تالیف بھی کتب ستہ کے رجال سے متعلق ہے۔
۸-تہذیب الکمال فی اسماء الرجال تالیف: ابوالحجاج المزی (۷۴۲ھ)، اس میں اصحاب کتب ستہ کی دیگر مؤلفات کے رجال کا اضافہ کیا گیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ کی ۵ کتابیں، امام مسلمؒ کا مقدمہ، امام ابوداودؒ کی ۷ کتابیں، امام ترمذیؒ کی شمائل، امام نسائیؒ کی ۴ کتابیں اور امام ابن ماجہؒ کی ایک کتاب ان میں شامل ہیں۔

اللہ پاک نے حافظ مزیؒ کی کتاب کو کافی مقبولیت عطا فرمائی اور علماء امت نے اس کی کئی طرح خدمت کی، چنانچہ اس کی قسم اخیر جو کنیٰ سے متعلق ہے رافع السلامی (۷۱۸ھ) نے اس کا اختصار کیا جس کا نام

۱:......الکنی المختصر من تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ہے۔
۲:......ان کے بعد حافظ ذہبیؒ (۷۴۸ھ) نے اس کی مختلف طریقوں سے خدمت کی اور اس سے (۴) کتابیں تیار کیں:

① -تذہیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال۔
② -الکاشف فی معرفۃ من لہ روایۃ فی الکتب الستۃ۔ یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہے۔
③ -المجرد من تہذیب الکمال، یہ طبقات پر مرتب ہے۔
④ -المقتضب من تہذیب الکمال، یہ حروف تہجی پر مرتب ہے۔

۳:......اسی طرح ابوالعباس اندرشی (۷۵۰ھ) نے بھی تہذیب الکمال کا اختصار کیا۔
۴:......علاء الدین مغلطائی حنفی (۷۶۲ھ) نے بھی اس کی خدمت کی اور اپنی کتاب کا نام ''اکمال تہذیب الکمال فی اسماء الرجال'' رکھا۔
۵:......شمس الدین حسینی نے بھی اس پر کام کیا اور اس میں سے کتب ستہ کے علاوہ رواۃ کو حذف کرکے اس میں موطأ مالک، مسند احمد، مسند شافعی اور مسند ابی حنیفۃ للحارثی کے رجال کا اضافہ کیا، موصوف کی تالیف کا نام ''التذکرۃ فی رجال العشرۃ'' ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ دکتور بشار عواد نے تہذیب الکمال کے مقدمے میں مسند ابی حنیفۃ

للحارثی کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسند ابی حنیفۃ لملاخسرو ہے، جیسا کہ علامہ عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو: تعجیل المنفعۃ، ص:۲۳۵)

۶:.......عماد الدین ابن کثیرؒ (۷۷۴ھ) کی بھی اس حوالہ سے ایک کتاب ہے جس کا نام ''التکمیل فی الجرح والتعدیل ومعرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل '' ہے، اس میں موصوف نے ''تھذیب الکمال'' اور اپنے شیخ کی ''میزان الاعتدال'' کو کچھ اضافوں کے ساتھ جمع کیا ہے۔

۷:.......ابن بردس بعلبکی حنبلیؒ (۷۸۶ھ) نے بھی ''بغیۃ الأریب فی اختصار التھذیب '' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔

۸:.......ابن الملقن شافعیؒ (۸۰۴ھ) کی تالیف ''اکمال تھذیب الکمال '' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۹:.......ابن قاضی شہبہؒ (۸۵۱ھ نے بھی ''تھذیب الکمال '' کا اختصار کیا ہے جس کا حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب کشف الظنون میں ذکر کیا ہے۔

۱۰:.......ابن حجرؒ (۸۵۲ھ) کی بھی تصنیف ہے ''تھذیب التھذیب '' کے نام سے، پھر موصوف نے اپنی اس کتاب کا خود اختصار کیا جو ''تقریب التھذیب '' کے نام سے مشہور ہے۔

۱۱:.......تقی الدین ابن فہد (۸۷۱ھ) کی بھی اس سلسلے میں ایک تالیف ہے جس کا نام ''نھایۃ التقریب وتکمیل التھذیب بالتذھیب'' ہے۔ (مقدمۃ تہذیب الکمال، د. بشار عواد)

⑤-ضعف کی بعض خاص اقسام سے متعلق لکھی گئی چند کتب کا ذکر:

۱-کتاب المدلسین تالیف: علی بن المدینیؒ (الفہرست لابن الندیم، ص:۲۳۱)

۲-تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس، تالیف: ابن حجرؒ۔

۳- الاغتباط بمن رمی بالاختلاط، تالیف: سبط ابن العجمی (۸۴۱ھ) (نظریۃ نقد الرجال ومکانتہا فی ضوء البحث العلمی، تالیف: د. عماد الدین محمد الرشید، ص:۳۷۳)

سبط ابن العجمیؒ کی کتاب اپنے موضوع سے متعلق کافی فائدہ کی حامل ہے جس کا اعتراف علامہ کوثریؒ نے بھی ''شروط الأئمۃ الخمسۃ للحازمی'' پر اپنے حواشی میں کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: ص:۱۴۶)

⑥-شاگرد واستاذ کے درمیان سوال وجواب کے طرز پر لکھی گئی کچھ کتب کا ذکر:

۱-سؤالات ابن المدینی لیحیی فی الجرح والتعدیل۔
۲-سؤالات محمد بن عثمان بن أبی شیبۃ لعلی بن المدینیؒ۔
۳-سؤالات عثمان الدارمی لیحییٰ بن معینؒ۔
۴-السؤالات عن احمد بن حنبل لمسلم بن الحجاجؒ۔

(المنہج الاسلامی فی الجرح والتعدیل، ص:۶۵، د. فاروق حمادہ)

یہ چند سطور تھیں فن جرح وتعدیل سے متعلق جس سے اس فن کی ابتدا، اس کی تاریخی حیثیت اور پھر اس کا ارتقا اور علماء امت کی اس حوالے سے خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور بلاشبہ یہ ان انفاسِ قدسیہ کا ہم پر احسان ہی ہے کہ جن کی بدولت آج یہ امت برملا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات نقل کرنے والوں کی پیدائش سے لے کر وفات تک تمام حالات وواقعات کو بیان کرسکتی ہے اوران کی روایتِ حدیث میں حیثیت کا اندازہ لگاسکتی ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

گروہ ایک جویا تھا علم نبیؐ کا
لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا
کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح وتعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
اسی دھن میں آسان کیا ہر سفر کو
اسی شوق میں طے کیا بحر وبر کو
سنا خازنِ علم دیں جس بشر کو
لیا اس سے جاکر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزہ اس کا چکھ کر

فجزاهم الله عن الأمة خير الجزاء وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ اور مذہبی رواداریاں

(فتح علی خان قریشیؒ ،متوفی: ۱۲۱۳ھ = ۱۷۹۹ء)

معاذ کولہاپوری، ڈابھیل

سرزمینِ ہند کی پرامن فضاؤں میں آزادنہ سانس لیتے ہوئے دورِ فرنگی کا تذکرہ چھڑتا رہتا ہے اور مجاہدینِ وطن وشہدائے چمن کی قربانیوں کی یاددہانیوں اور مدح سرائیوں کی مجلسیں جمتی رہتی ہیں، یہ مجلسیں اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتیں تا آنکہ ٹیپو سلطانؒ کا تذکرہ نہ ہو۔

یہ سچ ہے کہ سلطانؒ جنگِ آزادی کے سرخیل تھے، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ان میں موجود تھیں جن سے لوگ ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ سلطانؒ کو ایک متعصب اور ہندو دشمن ظالم حکمراں کی حیثیت سے پیش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت بالکل برعکس ہے۔ غلط فہمیاں تو انگریز مؤرخین نے من گھڑت اور جھوٹی باتیں لکھ کر پھیلائی تھیں، ان کے جھوٹ کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک مثال کافی ہوگی: ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ: ٹیپو سلطانؒ نے صرف ''کورنگ'' (Korang) شہر میں ستر ہزار لوگوں کو قبولِ اسلام پر مجبور کیا تھا، حالانکہ عہدِ ٹیپو میں سرزمینِ ''کورنگ'' فقط پچیس سے تیس ہزار کی آبادی پر مشتمل تھی۔ (سیرتِ ٹیپو سلطان شہید، ص۴۳۲، مصنفہ: مولانا الیاس صاحب ندوی بھٹکلی)

مندروں پر عنایات

ٹیپو سلطانؒ نے مسجدوں اور مندروں کے درمیان کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا، جس طرح مسجدوں پر سلطانؒ کی نظریں رہیں اسی طرح مندروں پر بھی ان کی عنایات رہیں، جن کا اندازہ مندرجۂ ذیل چند مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے:

تعلقۂ نجن گڑھ (Nanjangarh) کے کالے نامی گاؤں میں واقع لکشمی کانتھ مندر میں چاندی کے چار پیالے، ایک پلیٹ اور ایک اگالدان اب بھی دیکھا جاسکتا ہے، جو ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اس مندر کو بطور نذرانہ کے دیا تھا۔

خود سری رنگا پٹنم (Srirangapatna) کے رنگناتھ مندر کو سلطانؒ نے ایک کافور دان اور چاندی کے سات پیالے دیے تھے اور یہ چیزیں آج تک اس مندر میں موجود ہیں۔ مقدم الذکر شہر کے ایک اور مندر سر کینٹھور کو ایک مرصع پیالہ- جس کے نچلے حصے میں پانچ قیمتی جوہرات جڑے ہوئے تھے- عطا کیا اور نارائن سوامی مندر کو قیمتی جواہرات سے آراستہ بہت سے برتن، ایک نقارہ اور بارہ ہاتھی عنایت کیے تھے۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص: ۴۳۸)

مندروں کی پاسبانی / پاسداری

سلطانؒ مندروں پر فقط خزانے لٹا کر عہدہ برآنہ ہوئے، بلکہ کئی مندروں کی مشکل اوقات میں حفاظت بھی کی ہے۔ ڈنڈیگل (Dindigul) تعلقہ پر حملہ کرتے ہوئے سلطانؒ نے اس کے عقبی حصہ سے گولہ باری کروائی تھی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ راجہ کا وہ مندر حملوں کی زد میں نہ آنے پائے جو قلعہ کے اگلے حصہ میں واقع تھا۔

ملیبار (Malabar) میں گروایوار پر قبضہ کے دوران وہاں کے ایک مندر کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کرنے والے کچھ مسلمان سپاہیوں کو سلطانؒ نے سزائیں بھی دلوائیں اور اسی وقت مندر کی مرمت بھی کروائی۔

کانجی ورم (Kanjivaram) کے اُس مندر کی تکمیل کے لیے (جس کی بنا ۱۷۸۰ء میں سلطان حیدرعلی نے رکھی تھی، مگر تکمیل نہ ہوسکی تھی) سلطان نے دس ہزار روپیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس موقع پر ہونے والی آتش بازیوں کے مصارف بھی خود برداشت کیے تھے۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص: ۴۳۸)

مندروں اور سوامیوں کا احترام

جب رگھوناتھ راؤ (Raghunathrao) کی قیادت میں مرہٹہ دراندازوں اور فتنہ پردازوں نے سرنگیر کے ایک مندر پر حملہ کیا، بیش قیمت املاک لوٹ کر لے گئے اور سارہ دیوی نامی مورتی کو باہر پھینک دیا جس کے نتیجہ میں مندر کے سوامی اور متولی شنکر گرواچاریہ فرار ہوکر شہر کارکل میں پناہ گزیں ہوئے اور سلطان سے حالات کی شکایت کی، تو سلطانؒ نے جواباً ایک خط سوامی کے نام ارسال کیا جس میں آپؒ نے اس قدر احترام کے ساتھ سوامی کو تسلی دی کہ خلافِ معمول گروجی کے نام کو اپنے نام پر مقدم کیا اور اسی پر بس نہیں، بلکہ ان کو اپنے زیر قبضہ دیہاتوں میں سے کسی بھی چیز کے لینے کا اختیار دیا، نیز اس علاقہ کے گورنر سے دوسو اشرفیاں مع غلہ دلوائیں اور سارہ دیوی کو احترام کے ساتھ اس کی جگہ نصب کرواکر اس تقریب کے موقع پر ایک ہزار فقراء کو کھانا کھلوایا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص: ۴۳۵)

ہندو عہدیدار مناصبِ علیا پر

سلطانؒ ہندوؤں کو فقط دور ہی سے نوازتے نہیں رہے، بلکہ انہیں بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز کررکھا تھا۔ سلطنتِ خداداد کا وزیرِخزانہ ہندو برہمن ''پورنیا'' تھا، یہی ''پورنیا'' باعتبار اختیارات کے وزیر اعظم میر صادق کے بعد سلطانؒ کا نائبِ دوم بھی تھا۔

سلطان کا ذاتی منشی اور معتمدِ خاص ''لالہ مہتاب رائے سبقت'' نامی ایک ہندو برہمن تھا، جو میدانِ جنگ میں بھی شاہی کیمپ میں رہتا تھا اور اخیر تک سلطانؒ کا وفادار رہا۔

میسور کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ہری سنگھ تھا، جس کا بھائی بھی باوجود ہندو ہونے کے حکومت کا ایک بڑا عہدیدار تھا۔ کورگ کی فوج کا افسرِ اعلیٰ ایک برہمن تھا۔ علاوہ ازیں تین ہزار کی ایک فوج سردار سیواجی کی کمان میں رہتی تھی، اسی طرح اور بھی کئی مناصبِ علیا پر غیرمسلموں کو فائز کررکھا تھا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص:۴۳۴)

حقوق میں مساوات

سلطان ٹیپوؒ نے جس طرح عبادت گاہوں میں برابری اور مساوات کا معاملہ کیا، اسی طرح انسانی حقوق میں بھی بلاتفریق ہندو و مسلم کے مذہبی رواداری کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ جہاں انہوں نے کرشنا راؤ اور اس کے بھائیوں کو غداری کی سزا میں تختۂ دار پر لٹکایا، وہیں محمد قاسم اور عثمان خان کشمیری کو بھی موت کے گھاٹ اتارا۔ جہاں سلطانؒ نے عیسائی غداروں اور نمک حراموں کے پیشوا اور قائدین کو موت کی سزا دی، وہیں ان مسلمان عورتوں کو بھی قتل کیا جنہوں نے انگریز سپاہیوں کے ساتھ بدکاری کی تھی۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص:۴۳۳)

اہل سنت و جماعت سے عقائد میں بنیادی فرق کی بنا پر مہدوی فرقہ کو سلطانؒ غیرمسلم ہی گمان کرتے تھے، نیز یہ لوگ سلطنتِ خداداد کے لیے آستین کے سانپ تھے، ان میں سے بھی بہتیرے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کررکھا تھا۔ جب ان کی انگریزوں کی خفیہ حمایت پر ایک مدتِ دراز گزر گئی اور ذکر بالجہر کا وہ خاص غیرشرعی طریقہ- جس کے یہ لوگ قائل تھے- پوری پوری رات اڑوس پڑوس کے لوگوں کی تکلیف کا باعث بننے لگا اور برملا حکم عدولیاں کرنے لگے، تو سلطانؒ نے مذکورہ جرائم میں حدتجاوزی کی وجہ سے ان کو جلاوطن کردیا۔

عیسائیوں کے ساتھ سلطان کا سلوک

عیسائیوں کے ساتھ بھی سلطانؒ کا رویہ کچھ مختلف نہ تھا۔ سلطان نے کئی فرانسیسی عیسائیوں کو اپنی سلطنت میں عہدے سپرد کررکھے تھے۔ آرمینیہ کے عیسائی تاجروں کو بھی اپنے ملک میں آکر تجارت کرنے کی اجازت ہی نہیں دی، بلکہ ان کی مالی پشت پناہی بھی کی۔ گو اسے تارکینِ وطن عیسائیوں کو دوبارہ اپنی سلطنت میں لاکر بسایا۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص:۴۴۵)

رعایا کے دل میں سلطانؒ کی عقیدت ومحبت

رعایا میں سلطان ٹیپو کی عقیدت اس قدر تھی کہ ہندو مذہب کے دو فرقوں واڈ گلائی اور ٹنکالائی کے درمیان اختلاف ہونے پر خود ہندوؤں نے سلطان کو اپنا حکم اور ثالث بنایا تھا۔ بھلا اگر سلطانؒ ظالم اور ہندو دشمن ہوتے تو یہ صورتِ حال کیوں کر ممکن ہوتی؟

سلطانؒ کی مذہبی رواداری ہی تو تھی جس نے رعایا کے سینوں میں عقیدت ومحبت کے وہ شعلے فروزاں کیے تھے جنہیں دیکھ کر انگریز بھی ششدر رہتے تھے۔ سلطانؒ نے جس جگہ اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی اسی جگہ سلطانؒ کے سینکڑوں فدائین کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، جن میں عورتیں بھی تھیں اور جوان لڑکیاں بھی۔ جب سلطان کا جنازہ اُٹھایا جانے لگا تو راہ میں ہندو عورتیں ماتم کرتے ہوئے اپنے سروں پر مٹی ڈال رہی تھیں۔ (سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص:۴۴۳) اسی لیے ظفر علی خان نے کہا تھا:

قوتِ بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعا گوؤں میں شامل تھے ہنود

قارئین کرام!!! سلطانؒ کی مذہبی رواداری اور بلاتفریقِ مذہب رعایا سے حسنِ سلوک ملاحظہ فرمائیں اور دوسری طرف ہندو فرقہ پرستوں کے منہ سے نکلا ہوا زہر دیکھئے، تاریخ کے مسخ کرنے اور اُسے مٹانے کی زندہ مثال آپ کو واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ جو لوگ تحمل مزاجی اور برداشت کی دولت سے محروم ہیں اور جو تعصب کے ناپاک نالے کے گندے کیڑے ہیں، جو سانپ وبچھو کی طرح ہمیشہ زہر اُگلتے رہتے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں کہ سلطان ہندو کُش اور متعصب ظالم حکمران تھا!!! کاش ایک نظر اپنے دامن پر بھی ڈال لی ہوتی!

دامن تو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

افسوس اس پر بھی ہے کہ سرزمینِ ہند کے اس عظیم سپوت کے حالاتِ زندگی اور اس کے قابلِ رشک کارنامے باشندگانِ ملک تک صحیح معنوں میں پہنچائے نہیں گئے ہیں، ورنہ ممکن نہ تھا کہ سلطانؒ کو متعصب اور ہندو دشمن ظالم حکمران کہا جاتا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری، غیر مسلموں کی خوشی وغم میں شریک ہونے اور ان کے مذہبی جذبات کا خیال رکھنے میں سلطانؒ اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ بعض مواقع پر فقہی اعتبار سے اس پر بحث بھی کی جاسکتی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ خود مسلمانانِ ہند اپنے سلاطین وحکمرانوں کے کارناموں اور ان کی عدل پروری کی داستانوں سے ناواقف ہیں۔ اگر ٹیپو سلطان کے مسئلہ میں سنجیدگی اختیار نہ کی گئی اور اُسے پڑھا اور پڑھایا نہ گیا تو وہ دن دور نہیں جب ٹیپو سلطانؒ جیسا عادل حکمران بھی ''محمود غزنویؒ'' اور اورنگ زیبؒ'' کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہوگا اور مسلمانِ ہند وکیلِ صفائی بن کر وضاحتیں دے رہے ہوں گے۔ لیکن افسوس!!! تب پانی سر سے اوپر ہو چکا ہوگا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

علماء اور مشائخ کی نظر میں (دوسری اور آخری قسط)

جناب نعمان محمد امین

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی

۱۹- مولانا فقیر محمد جہلمی نے ۱۸۸۰ء میں ''حدائق الحنفیہ'' نامی کتاب لکھی، جس میں انہوں نے حنفی علماء اور فقہاء کا تذکرہ کیا ہے، انہی علماء کی فہرست میں آپ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہایت حقیقت پسندانہ کیا ہے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے وقت یہ الفاظ بھی آپ کے مضمون کا حصہ تھے کہ:

> ''علامۂ عصر، فہامۂ دہر، فاضل متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذہین، معقولات کے گویا پتلے تھے۔ آپ لڑکپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری تھے۔'' (حدائق الحنفیہ، ص:۴۹۲)

حافظ عبدالرحمٰن حیرت

۲۰- حافظ عبدالرحمٰن حیرت اپنی کتاب ''سفینۂ رحمانی'' ۱۸۸۴ء سن طباعت میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بیشۂ فضل و کمال کے شیر، گل زارِ عشقِ الٰہی کی خوش بو، شبستانِ طریقت و شریعت کی شمع، آسمانِ حقیقت و معرفت کے خورشید، عالم کامل اور جود و سخا میں رشکِ حاتم، جناب حضرت مولوی محمد قاسم صاحب (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے) قصبہ نانوتہ کے برگزیدہ علماء و فضلاء میں سے تھے، طرح طرح کے علوم کی منزلیں اور قسم قسم فنون کے رموز اور ان کے نشیب و فراز انہوں نے اپنی خداداد ہمت و استعداد سے کامل طور پر طے کیے تھے، انہیں کانِ علوم اور مخزنِ فنون کہنا چاہیے، ان کی توصیف میں منشی فکر و خیال جو بھی لکھے بجا ہے اور ان کی تعریف جس قدر بھی کی جائے زیبا ہے۔'' (سفینۂ رحمانی، ص:۱۱۹)

مرزا آفتاب بیگ

۲۱-مرزا آفتاب بیگ دہلویؒ اپنی کتاب ''تحفۃ الابرار'' سن طباعت ۱۹۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''آپ (مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) رؤسائے شیوخ صدیقی قصبہ نانوتہ کے ہیں۔ آپ کو اجازت ہر چہار طریقہ معروف کی حضرت حاجی محمد امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تھی اور سند حدیث کی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ محققانہ و عارفانہ کلام حقایق و معارف آپ کا تھا۔ اثباتِ وجودی سے رطب اللسان تھے، توحید شہودی سے بھی انکار نہیں رکھتے تھے''۔

مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی

۲۲-مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی اپنی کتاب ''انوار العاشقین'' میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام عمر میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، بوجہ کسر نفسی اور کمال تواضع کے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ بیعت بھی حضرت قبلۂ عالم حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نیابۃً کرتے تھے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عشق اور محبت میں فنا تھے۔'' (انوار العاشقین، ص:۸۸)

مولانا حافظ شاہ محمد سراج الیقین

۲۳-اپنی کتاب ''شمس العارفین'' سن طباعت ۱۳۳۳ھ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''جس شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر سنی ہوگی یا تحریر دیکھی ہوگی وہ سمجھ سکتا ہے کہ کس معدن سے یہ علوم اور اسرار و حقایق آرہے ہیں، آپ صاحبِ تصانیف عالیہ ہیں اور آپ کے مناظروں کی تقریریں بھی چھپی ہیں، جن میں عجیب وغریب تحقیقاتِ علمیہ اور نکات عجیبہ اور مضامین رفیعہ پائے جاتے ہیں، درحقیقت ایسا فاضل متبحر اور عالم محقق اس زمانے میں کوئی نہیں گزرا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس پایہ کے لوگ کہیں صدیوں کے بعد ہوتے ہیں۔ آپ نہایت پاکیزہ اخلاق اور منکسر المزاج تھے اور لباس نہایت سادہ اور معمولی موٹا استعمال فرماتے تھے۔ صفتِ قناعت بھی بہ درجۂ کمال آپ میں موجود تھی، ہمیشہ معمولی تنخواہ پر بسر فرمائی اور بڑی بڑی تنخواہوں کی نوکریوں کو پسند نہیں فرمایا۔ مدرسہ عالیہ دیوبند میں عرصہ تک آپ کا درس و تدریس اور بے انتہا فیض جاری رہا۔ اکابر علماء آپ کے شاگرد ہیں۔'' (شمس العارفین، ص: ۴۷-۴۶)

سر سید احمد خان

۲۴-حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر سر سید احمد خان نے ایک طویل تعزیتی مضمون لکھا، جن میں یہ الفاظ بھی شامل تھے:

''اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسمؒ اس دنیا میں بے مثل شخص تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق صاحبؒ سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہو جانا، ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے''۔ (علی گڑھ گزٹ، ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء)

مولوی رحمٰن علی

۲۵-مولوی رحمٰن علی اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے ہند'' جو انہوں نے ۱۸۹۱ء میں لکھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولوی محمد قاسم نانوتویؒ بن شیخ اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم نانوتوی، ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے، ان کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جدتِ طبع اور جودتِ ذہن (ذکاوت، ذہانت، لیاقت) فطری طور سے ودیعت (سپرد کرنا، حوالے کرنا) فرمایا تھا۔'' (تذکرہ علمائے ہند)

علامہ شاہ محمد جمیل الرحمٰن حنفی قادری چشتی نظامی

۲۶-آپ اپنی کتاب ''تذکرہ وصال الجمیل'' جو آپ نے ۱۳۴۳ھ میں تالیف فرمائی، اس کتاب میں آپ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانائے موصوف عالم، فاضل اور مشہور مناظر ہونے کے علاوہ نہایت عابد، زاہد، قانع، متوکل، نہایت خلیق واقع ہوئے تھے۔ عربی، فارسی نظم و نثر بے تکان لکھتے بولتے تھے، سیدھے سادے اتنے تھے کہ آپ کی وضع طرح پر علمیت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔''

حضرت شاہ عبدالرحیم سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ

۲۷-مولانا محمد امیر باز خانؒ ''شہادات امیریہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''خبرِ حسرت اثر مولانا و استاذنا مولوی محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی آئی تو حضرت (شاہ عبدالرحیم سہارن پوریؒ) نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ: آج میری پشت دو صدموں سے ٹوٹی ہے: ایک مرگ مولوی محمد قاسم کی ہے، دوم رحلت مولوی احمد علی صاحب (سہارن پوری) سے۔ یہ دونوں بزرگ وار بے ریا، متبع شریعت، مفیض اکمل تھے، مجھ کو ان کے باعث بڑی تقویت تھی، اب میں تنہا رہ گیا۔ (شہادات امیریہ علیٰ مکشوفات رحیمیہ، ص:۱۴)

حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

۲۸- حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تالیف ''کمالاتِ رحمانی'' میں لکھتے ہیں:

''اب بیعت کا جوعزم ہوا مجھ (مولانا شاہ تجمل حسین بہاری رحمۃ اللہ علیہ) کو عقیدت اور غلامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ آپ (حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کو کشف سے معلوم ہوا، آپ نے حضرت مولانا کی تعریف کی کہ اس کم سنی میں ان کو ولایت حاصل ہوگئی۔''

مولانا محبوب الرسول صاحب، الٰہ شریف ضلع جہلم

۲۹-حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو میں اولیاء سے سمجھتا ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی آیت تھے، اسلام اور علم کی جواُن سے اللہ تعالیٰ نے خدمت لی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔'' (ڈھول کی آواز، ص:۱۱۷)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (بھیرہ شریف)

۳۰-''حضرت قاسم العلومؒ کی تصنیف لطیف مسمی بہ تحذیر الناس کو متعدد بار غور و تامل سے پڑھا اور ہر بار نیا لطف اور سرور حاصل ہوا۔ علماءِ حق کے نزدیک حقیقت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام متشابہات میں سے ہے اور اس کی صحیح معرفت انسانی حیطۂ امکان سے خارج ہے، لیکن جہاں تک فکر انسانی کا تعلق ہے حضرت مولانا قدس سرہٗ کی یہ نادر تحقیق کئی شپرہ چشموں کے لیے سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتی ہے۔ رہے فریفتگانِ حسن مصطفوی تو ان بے قرار دلوں اور بے تاب نگاہوں کی وارفتگیوں میں اضافہ کا ہزار ساماں اس تحذیر الناس میں موجود ہے۔ آپ نے اپنے علمی، دقیق اور محققانہ انداز میں یہ واضح کرنے کی سعی فرمائی ہے کہ ہر قسم کا کمال علمی ہو یا عملی، حسی ہو یا معنوی، ظاہری ہو یا باطنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی کمال ہے۔'' (ڈھول کی آواز، ص:۱۲۸-۱۳۰)

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

۳۱۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ جلسے میں کہا تھا:
''عربی کے بیسیوں مدرسے کانپور میں قائم ہیں وہ کس نے قائم کیے ہیں؟ سوداگروں نے، دنیاداروں نے............کسی عالم نے نہیں قائم کیے، سوائے مدرسہ دیوبند کے، جس پر ہم فخر کرتے ہیں جس کو مولانا قاسم مرحوم نے قائم کیا تھا، علاوہ اس کے مدرسہ کسی عالم نے قائم نہیں کیا۔'' (رپوٹ سالانہ ندوۃ العلماء، ۱۹۱۲ء، ص: ۱۰۹-۱۱۰)

مولانا غلام رسول مہرؒ

۳۲: مولانا غلام رسول مہر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:
''بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ احترام واعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم ہیں۔ ان کے اسماءِ گرامی اس سرزمین کے آسمانوں پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندر میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار دارالعلوم دیوبند ایسی ہے جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دوائر میں قابلِ فخر ہیں۔'' (۱۸۵۷ء کے مجاہد، ص: ۱۶۳، سن اشاعت ۱۹۵۷ء)

سائیں توکل شاہ انبالوی

۳۳-مولانا مشتاق احمد چشتی انبیٹھوی مؤلف ''انوارالعاشقین'' فرماتے ہیں:
''حضرت عارف باللہ شیخی توکل شاہ صاحب مجددی نے عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں پائے مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں، میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچوں، چناں چہ میں آگے ہوگیا''۔ (انوارالعاشقین، ص: ۸۸)

یہ چند باتیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے ہم عصر اور بعد کے علماء اور مشائخ

کی ہیں، جن میں ان حضرات کے بھی نام شامل ہیں، جن کے عقیدت مند آج حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف زہر اُگلتے نہیں تھکتے۔ آخر میں اپنی بات حدیث قدسی پر ختم کرنا چاہوں گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو پکارتا ہے جبرئیل علیہ السلام کو اور یہ فرماتا ہے کہ بے شک اللہ نے فلاں کو دوست رکھا ہے، سوتو بھی اس کو دوست رکھ، تو جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت رکھتے ہیں، پھر جبرئیل علیہ السلام آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے، سوتم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس محبوب بندے کی قبولیت زمین پر اُتاری جاتی ہے، یعنی زمین کے نیک لوگ اس کو مقبول جانتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں اور جب اللہ کسی سے ناراض ہوتا ہے تو بھی اس طرح کرتا ہے یعنی اس کا الٹ۔'' (مؤطا امام مالکؒ، جلد:۱، حدیث نمبر:۱۶۴۱)

اپنے بہت ہی محدود مطالعے سے چند حوالے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کرنے والے اور مقبول جاننے والے علما و مشائخ کے نقل کر دیئے ہیں، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے چاہنے والوں کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں میں ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اپنے اس محبوب بندے کے چاہنے والوں میں ہمارا شمار کر کے ہماری بخشش کا پروانہ جاری کر دے۔ آمین

نانی مرحومہ کی وفات

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

اہلیہ مرحومہ حضرت مولانا گل محمد سکھروی رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خوشدامن (ساس)، صوبہ سندھ کے مشہور عالم دین، امام الصرف والنحو، سکھر کی قدیم دینی درسگاہ جامعہ انوار العلوم کے بانی حضرت مولانا شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بہو، حضرت مولانا گل محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ، جامعہ کے شعبہ حفظ وناظرہ کے نگران حضرت مولانا قاری محمود الحسن صاحب زید مجدہٗ کی والدہ ماجدہ اور راقم الحروف کی نانی محترمہ، ۱۱؍ذوالقعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۵؍اگست ۲۰۱۶ء بروز پیر کی صبح لیاقت نیشنل ہسپتال کے کارڈیو وارڈ میں تقریباً سو سال کی عمر میں راہی عالم آخرت ہوگئیں، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون ، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی، أللّٰھم اغفرلھا وارحمھا وعافھا واعف عنھا وأکرم نزلھا ووسع مدخلھا واغسلھا بالماء والثلج والبرد ونقھا من الذنوب والخطایا کما ینقی الثوب الأبیض من الدنس وأبدلھا دارا خیرا من دارھا وأھلا خیرا من أھلھا وأدخلھا الجنۃ وأعذھا من عذاب القبر۔

نانی مرحومہ عابدہ زاہدہ صابرہ خاتون تھیں، صوبہ سندھ کے قدیم اور تاریخی روایات کے حامل معروف شہر سکھر میں جامعہ انوار العلوم ایک ممتاز اور قدیم دینی ادارہ ہے، چونکہ مرحومہ کے ماموں اور سسر حضرت مولانا شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس ادارے کے بانی اور مؤسس تھے، اس لیے ساری زندگی طلبہ، علماء اور مدرسہ کی خدمت میں گزاری، اسی خدمت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، اس ادارے کو ہر دور میں دینی جماعتوں کا مرکز ہونے کا شرف حاصل رہا ہے، علماء وصلحاء

کی میز بانی اس ادارے کا امتیاز ہے، حضرت مولانا سید تاج محمد شاہ امروٹیؒ ، حضرت مولانا حماد اللہ شاہ ہالیجویؒ ، حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ ، حضرت مولانا عبدالکریم بیرشریف والے رحمۃ اللہ علیہم جیسے صلحاء و بزرگ اور دیگر کئی اکابر علماء کرام کا سکھر میں ٹھکانہ اور جائے اقامت یہی ادارہ رہا، مرحومہ اس ادارے کے تمام طلبہ اور اساتذہ اور آنے والے تمام مہمانوں کا کھانا خود تیار فرماتی تھیں، سکھر کی گرمی اور تپش مشہور اور ضرب المثل ہے، لیکن اہلیانِ انوارالعلوم سکھر کی میز بانی نے ہمیشہ دلوں کو ٹھنڈک اور راحت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، نانی مرحومہ گھنٹوں گھنٹوں اسی گرمی میں سینکڑوں طلبہ کا کھانا خود تیار کرتی تھیں، جب تک صحت نے اجازت دی مدرسہ کا باورچی رکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی، سکھر میں آئے ہوئے تمام اکابر علماء اور بزرگ مرحومہ ہی کے ہاتھ کا پکا کھانا تناول فرماتے تھے۔

مرحومہ کی منجملہ صفاتِ فاضلہ میں سے ایک اہم صفت دنیا سے بے رغبتی اور زہد تھی، جس کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے لیے خود سے نئے کپڑے نہیں سلوائے، بارہا ان کی اولاد نے اصرار کیا کہ ہم آپ کے لیے نئے کپڑے سلوادیتے ہیں، مگر آپ سختی سے منع فرمادیتیں۔ اگر کبھی کوئی ہدیہ کے طور پر نئے کپڑے پیش کرتا تو خود پہننے کے بجائے دوسروں کو ہدیہ کردیتیں۔

مرحومہ کے شوہر اور میرے نانا محترم حضرت مولانا گل محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر والد ماجد محدث العصر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جو تعزیتی شذرہ ’’ماہنامہ بینات‘‘ میں رقم فرمایا تھا، بطور تذکار یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے:

> ’’یوم الجمعہ ۲۱؍ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ، دسمبر ۷۵ھ کو میری دوسری اہلیہ کے والد ماجد مولانا گل محمد صاحب سکھر میں داصل بحق ہوئے، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون ۔ مرحوم کے اخلاص، کرمِ نفس، جود وسخا، ہمت ومردانگی، جفاکشی، غیرتِ دینی، مکارمِ اخلاق کا مجھے پہلے سے علم ہو چکا تھا، دوسالہ تعلق کے عرصہ میں اُن کے اوصافِ حمیدہ کا مشاہدہ بھی ہوتا رہا، طویل ترین علالت کے دوران اُن کی استقامت وصبر کو دیکھ کر حیرت ہوئی، آخر میں دق وسل جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوئے، لیکن کیا مجال کہ ان کی خوش خلقی اور صبر وتحمل میں ذرا بھی فرق آیا ہو، کبھی اپنی تکلیف کی کسی سے شکایت نہیں کی، حکایتِ حال کے طور کچھ زبان پر کبھی آیا تو آیا۔ خواص میں اس قسم کے کمالات ہوں تو زیادہ تعجب نہیں ہوتا، لیکن عوامِ امت میں ایسی قابل رشک صفات یقیناً باعث تعجب ہیں۔

حق تعالیٰ کی اس مخلوق کے گمناموں میں نامعلوم کتنے اولیاء اللہ ہیں جن کا کسی کو علم نہیں،

اگر مشاہیر میں یہ کمالات ومحاسن موجود ہوں جب بھی قابل قدر ہیں، لیکن غیر مشہور گمنام شخصیتوں میں اس قسم کے محاسن حیرت افزا ہیں ....مرحوم انوار العلوم سکھر کے روحِ رواں تھے، اس کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں تھے، ان کی اہلیہ محترمہ طلبہ کے لیے سکھر کی گرمی میں سالن اور روٹی اپنے ہاتھ سے تیار کیا کرتی تھیں اور صبح وشام گھنٹوں یہ صبر آزما خدمت انجام دیا کرتی تھیں اور اب بھی کرتی ہیں۔‘‘ (بصائر وعبر، ج:۲،ص:۵۲۳،طبع: مکتبہ بینات)

نانی مرحومہ نے پسماندگان میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں سوگوار چھوڑی ہیں، ماشاء اللہ! تینوں صاحبزادے عالم ہیں، اور دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، پوتے اور نواسوں میں بھی کثیر تعداد علماء اور حفاظ کی ہے، جو اِن شاء اللہ! مرحومہ کے لیے صدقہ جاریہ ہیں اور جن طلبہ کی ساری زندگی خدمت کرتی رہی ہیں، وہ بھی ان شاء اللہ! مرحومہ کی باقیات صالحات کا حصہ ہیں۔

وفات سے چند یوم قبل کمزوری وعلالت کے باعث مرحومہ کو لیاقت نیشنل ہسپتال میں داخل کیا گیا، ڈاکٹروں نے دل کے عارضہ کی تشخیص کی، بالآخر ۱۱؍ذوالقعدہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۵؍اگست ۲۰۱۶ء بروز پیر کی صبح پونے گیارہ بجے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، وفات کے کچھ دیر بعد مرحومہ کو جامعہ بنوری ٹاؤن لایا گیا، نمازِ ظہر کے بعد جامعہ کی مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی، جنازے میں علماء اور طلبہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی، جنازے کے بعد مرحومہ کو آبائی علاقہ سکھر لے جایا گیا، مرحومہ کے بڑے صاحبزادے چونکہ نماز جنازہ میں شرکت نہ کرسکے تھے، اس لیے تقریباً رات ساڑھے دس بجے سکھر پہنچنے کے بعد گیارہ بجے جامعہ انوار العلوم سکھر میں حضرت مولانا تاج محمد صاحب زیدمجدہٗ کی امامت میں دوسری نماز جنازہ ادا کی گئی اور ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ کے عقب میں واقع خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے مہتمم استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب زیدمجدہم، اساتذہ کرام اور دیگر احباب ومخلصین نے مرحومہ کے انتقال پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار کیا اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت اور رفع درجات کی دعا کی۔ بروز جمعرات ۱۴؍ذوالقعدہ جامعہ بنوری ٹاؤن کی مسجد میں مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی بھی کی گئی۔ حق تعالیٰ مرحومہ کی زندگی بھر کی حسنات وخدمات کو قبول فرماکر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور رحمت ورضوان کا معاملہ فرمائے۔ ادارہ بینات اپنے باتوفیق قارئین سے مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی درخواست کرتا ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

بھینس کی قربانی!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

بھینس کی قربانی قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟ بعض حضرات اس کی قربانی کو ناجائز کہتے ہیں، لیکن خیرات کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ والسلام: محمد زکریا، کراچی

الجواب حامدًا ومصليًا

واضح رہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء، مفسرین وائمہ کرام رحمہم اللہ کے نزدیک بھینس‘ گائے کی نوع میں شامل ہے اوراس وجہ سے اس کی قربانی بھی درست ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

’’أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ الخ۔‘‘(المائدہ:۱)

اس آیت کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’پالتو جانور جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورۂ انعام میں بیان فرمائی گئی ہیں ان کو ’’أَنْعَام‘‘ کہا جاتا ہے۔اس جملہ میں اُس خاص معاہدہ کا بیان آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اونٹ، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کو حلال کردیا ہے، ان کو شرعی قاعدہ کے موافق ذبح کرکے کھا سکتے ہیں۔‘‘(معارف القرآن، ج:۳،ص:۱۳)

تمام علماء کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ سب ’’بهيمة الأنعام‘‘(چرنے چگنے والے چوپایوں) کی قربانی جائز ہے، کم ازکم بھینس کی قربانی میں کوئی شک نہیں ہے۔

نیز جہاں قرآن مجید میں حرام چیزوں کی فہرست دی ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:

’’قُلْ لَّآ أَجِدُ فِيْ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ إِلَّآ أَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَتًا أَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا۔‘‘ (الانعام:۱۴۵)

درج بالا دونوں آیات میں تمام چرنے والے جانوروں کی حلت کا عام حکم ہے، اس میں

بھینس بھی شامل ہے، کیونکہ وہ بھی چرنے والے جانوروں میں سے ہے، اسی طرح ''**بھیمۃ الأنعام**'' کی حلت میں بھی بھینس بصراحت شامل ہے، اس کا گوشت اور دودھ گائے کے گوشت اور دودھ کی طرح حلال وطیب ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک ہی جنس سے ہیں۔ اگر بھینس کو گائے کی جنس سے مانا جائے یا عمومِ بھیمۃ الانعام پر نظر ڈالی جائے تو حکمِ جوازِ قربانی کے لیے یہ علت کافی ہے۔ شرعاً بھینس چوپایہ جانوروں میں سے ہے اور ''بقر'' (گائے) میں شامل ہے، گائے کی قربانی جائز ہے اس لیے بھینس کی قربانی بھی جائز ودرست ہے۔ اس دلیل کو اگر نہ مانا جائے تو گائے کی ہم جنس بھینس کے دودھ اور اس کے گوشت کے حلال ہونے کی بھی دلیل مشکوک ہوجائے گی۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**کل ذی ناب من السباع، فأکلہ حرام**'' ہر کچلی (نوک دار دانت جو اگلے دانتوں کے متصل ہوتے ہیں) والے درندے کا کھانا حرام ہے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح وما یؤکل من الحیوان، ص:۱۴۷) اور بھینس یقیناً شریعت کے اس اصول کے تحت بھی نہیں آتی، کیونکہ یہ ''**ذی ناب من السباع**'' میں سے نہیں ہے۔ درحقیقت بنیادی طور پر تین اقسام کے جانور ہیں جن کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ قربانی کے لیے قابل قبول ہیں:

①:.......''**غنم**'' میں اس کی انواع اور نر و مادہ شامل ہیں، یعنی بھیڑ اور بکری۔

②:.......''**إبل**'' سے مراد اونٹ نر و مادہ۔

③:.......''**بقر**'' میں بھی اس کی انواع اور نر و مادہ شامل ہیں، یعنی گائے اور بھینس۔

چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''واضح ہو کہ جنس واجب میں یہ ہونا چاہیے کہ قربانی کا جانور اونٹ، گائے اور غنم تین اجناس سے ہو اور ہر جنس میں اس کی نوع نر و مادہ اور خصی وفحل سب داخل ہیں، کیونکہ اسم جنس کا ان سب پر اطلاق کیا جاتا ہے اور ''**معز**'' (بھیڑ) نوعِ غنم ہے اور ''**جاموس**'' (بھینس) نوعِ بقر ہے۔ قربانی کے جانوروں میں سے کوئی وحشی جائز نہیں ہے۔''

(فتاویٰ ہندیہ، ج:۵، ۲۹۷، طبع: رشیدیہ۔ بدائع الصنائع، ج:۵، ص:۶۹، دار الکتاب العربی بیروت)

ہدایہ میں ہے:

''**ویدخل فی البقر الجاموس لأنہٗ من جنسہٖ۔**'' (الہدایہ، ج:۲، ص:۴۴۷، باب الأضحیۃ)

امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ بھینس کا حکم گائے والا ہے۔''

(الاجماع لابن المنذر، ص:۴۸)

حافظ ابن قدامہ المقدسی لکھتے ہیں:

''ہمیں اس میں اختلاف کا علم نہیں ہے، ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے، نیز بھینس' گائے کی ایک نوع ہے۔'' (المغنی لابن قدامہ، ج:۲،ص:۵۹۴)

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہا کرتے تھے کہ:

''بھینس گائے کی طرح ہی ہے۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۳،ص:۲۱۹، وسندہ صحیح)

لہٰذا اس بات پر جمہور علماء اور ائمہ اسلام کا اجماع و اتفاق ہے کہ بھینس کی قربانی کا وہی حکم ہے جو گائے کا ہے، بھینس کو گائے کے ساتھ شامل وشمار کیا جائے گا۔ بکری اور گائے کی طرح بھینس کی قربانی اور خیرات کرنا شرعاً جائز اور قبول ہے۔ فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
محمد انعام الحق	شعیب عالم	محمد انس انور

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

عورت کا بغیر محرم کے حج پر جانا!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان کرام کہ ایک خاتون جو کہ مالدار اور صاحب حیثیت ہے اور اس کے پاس حج کے اخراجات بھی موجود ہیں وہ حج کرنا چاہتی ہے، مگر محرم نہیں ہے، یا محرم ہے مگر محرم کے اخراجات اس کے پاس نہیں ہیں، آیا اس صورت میں عورت بغیر محرم کے حج کے لیے جاسکتی ہے؟

نیز کیا کوئی عورت دیگر عورتوں کی جماعت کے ساتھ (جن کے ساتھ مرد بھی ہیں) جاسکتی ہے؟ اگر نہیں جاسکتی اور پوری زندگی محرم کا انتظام نہ ہو سکے تو یہ عورت گناہ گار ہوگی؟ مستفتی: محمد فخر الدین

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

صورتِ مسئولہ میں واضح رہے کہ عورتوں کے حج پر جانے کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ مکہ مکرمہ سے مسافتِ سفر کی مقدار دور ہوں تو ان کے ساتھ شوہر یا دیگر کسی محرم کا ہونا ضروری ہے۔ محرم کے بغیر سفر کرنا عورتوں کے لیے ناجائز اور حرام ہے، خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی، تنہا ہو یا اس کے ساتھ دیگر عورتیں ہوں، کسی بھی حالت میں جانا جائز نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ اگر وہ مالدار ہے اور اس کا شوہر یا کوئی محرم نہیں ہے یا محرم ہے مگر محرم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تو اس کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ وہ انتظار کرتی رہے، تا آنکہ محرم کا بندوبست ہو جائے یا محرم کے اخراجات کا بندوبست ہو جائے۔ اگر زندگی بھر محرم کا بندوبست نہ ہو سکے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مرنے سے قبل حج بدل کی وصیت کر جائے، تاکہ لواحقین حج بدل کرسکیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے، جب کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر عورت مالدار ہو اور اس پر حج فرض ہو تو اس صورت میں اگر محرم نہ ہو تو وہ معتمد اور دیندار عورتوں کے ساتھ حج پر جائے گی، جب کہ احناف کے نزدیک کسی بھی حالت میں عورت بغیر محرم کے سفر نہیں کرسکتی، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

''عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ لاتسافر المرأۃُ ثلاثًا إلا ومعھا ذو محرم۔''

ترجمہ: ......''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: نہیں سفر کرے کوئی عورت تین (دن کا) مگر یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں منقول ہے:

''لایحل لامرأۃٍ تؤمن باللّٰہ والیوم الآخر تسافر مسیرۃ ثلاثِ لیالٍ إلا ومعھا ذو محرم۔''

ترجمہ:.....''کسی بھی عورت کے لیے حلال نہیں ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتی ہے کہ محرم کے بغیر تین رات کا سفر کرے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''قال رسول اللّٰہ ﷺ لایَخلُوَنَّ رجلٌ بامرأۃٍ ولاتسافر امرأۃٌ إلا ومعھا محرم، فقال رجل: یا رسول اللّٰہ! اکتتبت فی غزوۃ کذا کذا وخرجت امرأتی حاجۃ، فقال: اذھب فاحجج مع امرأتک۔'' (مشکوٰۃ، ص:۲۲۱)

ترجمہ:.....''حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے اور کوئی عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔ ایک آدمی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! میں فلاں فلاں جنگ میں لکھ دیا گیا ہوں اور میری بیوی حج کے لیے نکلی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جا! اپنی بیوی کے ساتھ حج کر۔''

اسی طرح مختلف احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے عورتوں کو بغیر محرم کے سفر کرنے سے منع فرمایا، خواہ وہ سفر حج کے لیے ہو یا کسی اور کام کے لیے۔ نیز واضح رہے کہ تمام فقہائے احناف خواہ متقدمین ہوں یا متاخرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت بغیر محرم کے حج کے لیے سفر نہیں کرسکتی، خواہ حج فرض ہو یا نفل، عورت بوڑھی ہو یا جوان، جب کہ بعض فقہاء کرام کے نزدیک اگر عورت کا محرم نہ ہو تو اس پر حج فرض ہی نہیں، چنانچہ بدایۃ المجتہد لابن رشدؒ میں ہے:

''واختلفوا من ھذا الباب ھل من شرط وجوب الحج علی المرأۃ أن یکون معھا زوج أو ذو محرم منھا یطاوعھا علی الخروج معھا إلی السفر للحج. فقال مالک والشافعی رحمھما اللّٰہ: لیس من شرط الوجوب ذٰلک وتخرج المرأۃ إلٰی الحج إذا وجدت رفقۃ مأمونۃ وقال أبوحنیفۃؒ وأحمدؒ وجماعۃ: وجود ذی المحرم ومطاوعتہٗ لھا شرط فی الوجوب وسبب الخلاف معارضۃ الأمر بالحج والسفر إلیہ لتنھی عن سفر المرأۃ ثلاثًا إلا مع ذی محرم وذلک أنہٗ ثبت عنہ علیہ الصلاۃ والسلام من حدیث أبی سعید الخدریؓ وأبی ہریرۃؓ وابن عباسؓ

وابن عمرؓ أنهٗ قال علیه الصلاة والسلام: لایحل لامرأة تؤمن باللّٰه والیوم الآخر أن تسافر إلا مع ذی محرم۔ فمن غلب عموم الأمر قال: تسافر للحج وإن لم یکن معها ذو محرم ومن خص العموم بهذا الحدیث أو رأی من باب تفسیر الاستطاعة قال: لاتسافر لحج إلامع ذی محرم۔'' (بدایۃ المجتہد لابن رشد، ج:۱،ص:۳۱۱)

''فقہاء کرام کے درمیان اس باب میں اختلاف ہے کہ عورت کے ساتھ محرم یا شوہر کا ہونا حج فرض ہونے کے لیے شرط ہے؟ یعنی اس کے ساتھ شوہر یا ایسا محرم ہو جو اس کے ساتھ حج کے لیے جاسکے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: وہ (محرم) حج فرض ہونے کے لیے شرط نہیں، بلکہ اگر عورت کو معتمد عورت ساتھی ملے تو وہ ان کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور فقہائے کرامؒ کی ایک جماعت نے فرمایا کہ: عورت کے لیے محرم ہونا اور محرم کا اس کے ساتھ جانا شرطِ وجوب میں سے ہے۔ دراصل اس اختلاف کی وجہ حج کے لیے حکمِ الٰہی اور (دوسری طرف) عورت کے لیے نامحرم کے بغیر تین دن کا سفر کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ حضرت ابوسعید خدریؓ، ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کی حدیث کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کسی عورت کے لیے حلال نہیں ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے کہ وہ محرم کے بغیر کوئی سفر کرے۔ جو حضرات امر الٰہی کی عمومیت کو غالب قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عورت حج کے واسطے سفر کرے گی، اگرچہ اس کے ساتھ کوئی محرم نہ ہو اور جو حضرات (حکم الٰہی کی) عمومیت کو اس حدیث کی رو سے خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث (حکم خداوندی میں لفظ) ''استطاع'' کی تفسیر ہے وہ حضرات کہتے ہیں کہ عورت محرم کے بغیر حج کے لیے سفر نہ کرے۔''

فقہ حنفی کی مشہور و معتبر کتاب فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

''والمحرم فی حق المرأة شرط شابة کانت أو عجوزًا إذا کانت بینها وبین مکة مسیرة ثلاثة أیام. وقال الشافعیؒ: یجوز لها أن تخرج فی رفقة معها نساء ثقات. واختلفوا فی کون المحرم شرط الوجوب أم شرط الأداء حسب اختلافهم فی أمن الطریق وفی السغنانی: والصحیح أنه شرط الأداء۔'' (فتاویٰ تاتارخانیہ، ج:۲،ص:۴۳۴)

ترجمہ:......''اور محرم ساتھ ہونا عورت کے لیے شرط ہے خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی ہو جب اس کے درمیان اور مکہ کے درمیان تین دن کا راستہ ہو اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: عورت کے لیے نکلنا جائز ہے جب اس کے ساتھ ثقہ عورتیں ہوں۔ فقہاء

کرام میں اختلاف ہے کہ آیا محرم کا ہونا وجوبِ حج کے واسطے شرط ہے یا ادائیگی حج کے واسطے شرط ہے؟ جب کہ منشأ اختلاف ''امن الطریق'' کی تعریف کا اختلاف ہے۔ ''السغناقی'' میں ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ محرم ہونا ادائیگی حج کے لیے شرط ہے۔''

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''**منها المحرم للمرأة شابةً كانت أو عجوزًا إذا كانت بينها وبين مكة مسيرة ثلاثة أيام۔**'' (فتاویٰ عالمگیری، ج:۱،ص:۲۱۹)

ترجمہ:.....''ان میں سے (ایک شرط) عورت کے لیے محرم کا ہونا ہے خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی، جب کہ اس کے اور مکہ کے درمیان تین دن کی مسافت ہو۔''

''**وفي رسائل الأركان ثم المرأة إنما يجب عليها الحج إذا كان معها زوج أو محرم إن كان بينها وبين مكة مسيرة السفر لما روى الشيخان عن ابن عباسؓ.......۔**'' (رسائل الارکان،ص:۲۳۹)

ترجمہ:......''رسائل الارکان میں ہے کہ عورت پر حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اس کے ساتھ شوہر یا کوئی محرم ہو، اگر اس کے اور مکہ کے درمیان سفر کی مقدار کا فاصلہ ہو، جیسا کہ بخاری اور مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے............۔''

الکشف فی الفتاویٰ میں ہے:

''**فأما الذي هو بالشرط فهو حج المرأة إذا وجدت محرمًا بعد هٰذه الأسباب السبعة فيكون عليها الحج وإن لم نجد محرمًا فليس عليها الحج في قول أبي حنيفةؒ وأصحابه وأبي عبد الله وفي قول الشافعيؒ عليها أن تخرج بنفسها۔**''

(الکشف فی الفتاوی،ص:۳۰۳، ج:۲)

ترجمہ:.....''عورت پر حج لازم ہونے کے لیے ان سات اسباب کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ جب اس کا محرم ہو اس صورت میں اس پر حج لازم ہوگا اور اگر اس کو محرم میسر نہ ہو تو اس پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب اور ابوعبد اللہ کے قول کے مطابق حج لازم نہیں ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے لیے لازم ہے کہ بغیر محرم کے تنہا حج کے لیے جائے۔''

فقہ حنفی کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں ہے:

''**وأما الذي يخص النساء فشرطان: أحدهما أن يكون معها زوجها أو محرم لها فان لم يوجد أحدهما لايجب عليها الحج وهذا عندنا، وعند الشافعيؒ هٰذا ليس**

بشرط ویلزمها الحج والخروج من غیر زوج ولامحرم إذا کان معها نساء فی الرفقة ثقات واحتج بظاهر قولهٖ تعالٰی: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً'' وخطاب الناس یتناول الذکور والإناث بلاخلاف الخ. ولنا ما روی عن ابن عباسؓ عن النبی ﷺ أنهٗ قال: ''ألا لاتحجن امرأة إلا ومعها محرم'' وعن النبی ﷺ أنهٗ قال: ''لا تسافر امرأةٌ ثلاثةَ أیام إلا ومعها محرم أو زوج'' ولأنها إذا لم یکن معها زوج ولا محرم لایؤمن علیها إذا النساء لحم علی وضم إلا ماذب عنه ولهذا لایجوز لها الخروج وحدها والخوف عند اجتماعهن أکثر ولهذا حرمت الخلوة بالأجنبیة وإن کان معها امرأة أخرىٰ والآیة لاتتناول النساءَ حالَ عدم الزوج والمحرم معها لأن المرأةَ لم تقدر علی الرکوب والنزول بنفسها ۔''
(بدائع الصنائع، ج:۲،ص:۱۲۳)

ترجمہ:...... ''عورتوں کے لیے جو شرائط مخصوص ہیں وہ دو ہیں: ایک یہ کہ اس کے ساتھ شوہر یا اس کا محرم ہو، اگر اس کا محرم نہ ہو تو اس پر حج فرض نہیں ہے۔ یہ ہمارا مذہب ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محرم شرط نہیں بلکہ اس پر حج لازم ہے اور اس کے لیے شوہر اور محرم کے بغیر نکلنا جب کہ اس کے ساتھ ثقہ جماعت عورتوں کی ہو ضروری ہے۔ ان کی دلیل باری تعالیٰ کے قول کا ظاہری مفہوم ہے کہ: ''اور اللہ کے واسطے لوگوں کے اوپر اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے اس شخص کے ذمہ جو کہ طاقت رکھے وہاں تک پہنچنے کی۔'' باری تعالیٰ کا یہ خطاب شامل ہے مذکر ومؤنث سب کو۔ ہماری دلیل جو کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضور ﷺ کی روایت ہے کہ فرمایا: ''آگاہ رہو! کوئی عورت حج نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔'' اور حضور ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: ''نہیں سفر کرے کوئی عورت تین دن کا مگر یہ کہ اس کے ساتھ محرم یا شوہر ہو۔'' کیونکہ اگر اس کے ساتھ شوہر یا محرم نہ ہو تو وہ (فتنہ سے) مامون نہیں ہوگی، کیونکہ عورتوں کی مثال قصائی کے تختہ پر رکھے گئے گوشت کی ہے جس کی حفاظت ضروری ہے، اسی لیے اس کا تنہا نکلنا جائز نہیں۔ (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ: (نیز عورتوں کے اجتماع سے خوف فتنہ زیادہ ہے، اسی لیے تو اجنبی کے ساتھ خلوت حرام ہے، اگرچہ اس کے ساتھ دیگر عورتیں بھی ہوں اور مذکورہ آیت ان عورتوں کو شامل نہیں ہوگی جن کا شوہر یا محرم نہیں۔ (نیز یہ کہ) عورت سواری پر سوار ہونے اور اس سے اترنے پر تنہا قدرت نہیں رکھتی۔''

علاوہ ازیں تمام فقہائے کرام اور محدثین ومفسرین کرام نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ عورتوں کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں ۔ اختصاراً وہ عبارتیں نقل کرنے کی بجائے صرف چند کتابوں کے حوالے درج کیے جاتے ہیں: تفسیر مظہری ،ص:۹۷، ج:۱۔ عمدۃ القاری ،ص:۲۲۱، ج:۱۰۔ الجوہرۃ النیرۃ ،ص:۱۹۳، ج:۱۔ الفتاویٰ السعیدیہ ،ص:۲۰، ج:۱۔ مجمع الانہر شرح ملتقی البحر ،ص:۲۶۲، ج:۱۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ،ص:۴، ج:۲۔ المجموع ،ص:۸۷، ج:۷ (شوافع) فتاویٰ عثمانی ،ص:۱۷۔ احسن الفتاویٰ ،ص:۵۲۲، ج:۴ وغیرہ

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہے کہ عورتوں کے حج پر جانے کے لیے شوہر یا کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے ، بغیر محرم کے عورتوں کے لیے جانا جائز نہیں ۔ یہی مسلک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور تمام فقہاء احناف ؒ کی یہی تحقیق ہے ۔

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	نظام الدین شامزی	محمد عبد القادر

دار الافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ادارہ

اصلاحی گزارشات

مصنف: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ۔صفحات: ۲۱۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الایمان کراچی۔ ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا زورِ بیان ودیعت فرمایا ہے کہ ہر اونچی سے اونچی اور مشکل سے مشکل بات بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کی زبانی سمجھنا بہت ہی سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم کے ان مختلف مقالات ومضامین اور بیانات کو یکجا کیا گیا ہے جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین کو مولوی سیّد محمد زین العابدین صاحب نے جمع کیا ہے۔''پیش لفظ'' حضرت ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ہے، ''سخن ہائے گفتنی'' حضرت مفتی رفیق احمد بالاکوٹی صاحب کا تحریر کردہ ہے اور ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے مفتی خالد محمود صاحب نے ''قلم کی نعمت'' کے عنوان سے بہت ہی مختصر مگر جاندار مضمون قلم بند فرمایا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب حضرات کی مساعی کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے ذریعہ ہدایت بنائے۔آمین۔

تحفظ مدارس اور علماء وطلباء سے چند باتیں

مصنف: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ۔صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الایمان کراچی۔ ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

قریب کے گزشتہ سالوں میں خصوصی اداروں کی جانب سے مدارس دینیہ کو قابو میں رکھنے کے لیے ان پر مختلف الزامات واتہامات عائد کیے گئے اور ہر سطح پر ان کے صاف ستھرے عملی کردار کو مسخ کر کے بدنما شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے اکابر کو کہ انہوں نے

بڑی حکمت عملی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جہاں حکومتی اہلکاروں کی ان ریشہ دوانیوں کا مسکت جواب دیا، وہاں عوام الناس کو صحیح صورت حال بتا کر ان کو مدارس کے بارہ میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے سے بھی بچایا۔ اس کتاب میں ''مدارس کا نصاب، مدارس کی غرض وغایت، نظامِ تعلیم کی ترتیب، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کا نظام امتحان، ذمہ دارانِ مدارس سے چند ضروری باتیں، علماء کی ذمہ داریاں، کامیاب استاذ، فتنہ پرور تحریکیں اور دینی دعوت کا طریقہ کار، حصولِ علم کے مقاصد، علم دین حاصل کرنے کا مقصد، تبلیغ و ہدایت کا سلسلہ اور ہماری ذمہ داری'' جیسے موضوعات کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ ان مضامین کو مختلف رسائل وجرائد سے جمع کرنے کا کام مولوی سیّد محمد زین العابدین صاحب فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن نے سرانجام دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے اور علماء وطلباء کے لیے اس کتاب کو راہنمائی کا ذریعہ بنائے، آمین۔

مشاہدات وتأثرات

مصنف: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ ۔صفحات: ۳۲۸ ۔ قیمت: درج نہیں ۔ ناشر: مکتبۃ الایمان کراچی ۔ ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۔

زیرتبصرہ کتاب میں ''سخن ہائے گفتنی'' کے عنوان کے تحت حضرت مفتی رفیق احمد بالاکوٹی بجا طور پر تحریر فرماتے ہیں کہ: ''امت محمدیہ کی تاریخ کے ہر دور میں ایسی شخصیات موجود رہی ہیں، جنہیں اپنے کردار میں اسوۂ رسول (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا عکس اور صحابہ کرامؓ کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے، اسی بنا پر امت کی علمی روایت رہی ہے کہ ذخیرۂ احادیث وآثار کی طرح، سلف صالحین کے حالات وواقعات اور علوم وافکار کی ترتیب وجمع بندی کا التزام بھی ہوتا رہا ہے، کتب سیر وسوانح کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔''

زیرتبصرہ کتاب ''مشاہدہ وتاثرات'' اسی علمی روایت کا تسلسل ہے جو سیرت وسوانح سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حضرت مولانا مفتی خالد محمود مدظلہٗ کا ایک پُرمغز ''مقدمہ'' ہے، جس میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ کے حالات اور ان کی علمی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ ان قیمتی مقالات ومضامین کو جمع کرنے کا کام مولوی سیّد محمد زین العابدین صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے علم وعمل کی جامع کئی شخصیات کا تعارف اور ان کی علمی خدمات سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....